محبت رنگ بدلتی ہے
سباس گل

فہرست

محبت رنگ بدلتی ہے

''ارے یہ کیاتم ایسے ہی بیٹھی ہو شاباش چینج کرلو اور سوجاؤ تھک گئی ہوگی گڑیا۔'' ذیشان نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی دلہن بنی سویرا کو حیرت اور محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے کہا بھی تو کیا کہا کل سے اب تک وہ ان کی زبان سے ایک جملہ ایک ایسا جملہ سننے کے لیے بے تاب تھی جو اس رشتے کی خوبصورتی اور مضبوطی کا مظہر بن کر اس کی بے چین روح اور پریشان دل کو سکون دے سکتا۔ مگر وہ تو ہنوز اس سے اسی طرح ٹریٹ کر رہے تھے جیسے وہ اب بھی صرف ان کے عزیز دوست کی بیٹی ہی ہو ان کی بیوی نہ ہو۔

ان کے اس رویے نے اس کے اس خیال کو تقویت دی کہ انہوں نے محض اس پر ترس کھا کر اسے اکیلا اور بے سہارا سمجھ کر اس سے خدا ترسی اور ہمدردی کے جذبات کے تحت شادی کی ہے۔ انہیں اس سے کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے ان کی عمروں میں پندرہ برس کا فاصلہ تھا وہ سترہ کی ہونے والی تھی اور ذیشان نے اپنی عمر کے تیسویں برس میں قدم رکھ رہا تھا۔

''گڑیا کیا سوچ رہی ہو؟'' ذیشان نے اسے گم صم دیکھ کر حسب عادت بہت نرمی اور محبت سے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تو اس نے اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار لیا اور زبان کی بجائے نفی میں سر ہلا کر ان کے سوال کا جواب دیا تو ذیشان کا دل ایک لمحے کو بہت تیزی سے دھڑکا اور نگاہیں اس کے دلکش، حسین اور معصوم سراپے پر تک گئیں۔ بس وہی ایک لمحہ تھا جو انہیں بے خود اور بے بس کر گیا وہ اپنی حالت پر

حیران ہو کر سر جھٹک کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

''آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے شانی میں آپ کے قابل تو نہ تھی یہ مجبوری کا طوق آپ کے گلے میں پڑ گیا ہے۔ آپ بھلا مجھے اس روپ میں کیسے قبول کر سکتے ہیں آپ تو میرے شانی انکل تھے نا اور میں آپ کی لاڈلی گڑیا اجالا گڑیا گڑیا ڈارلنگ بے بی سویٹ بے بی کو بیوی کے روپ میں دیکھنا آسان تو نہیں ہے نا بے شک میں آپ کے دوست کی بیٹی ہوں مگر آپ نے بھی تو مجھے ہمیشہ بچی سمجھ کر ٹریٹ کیا تھا پھر اب یہ قسمت آپ کو اور مجھے زندگی کے کس موڑ پر لے آئی ہے۔ کاش مما پاپا نہ جاتے کاش میں آپ کی زندگی یوں مشکل اور پریشان کن نہ بناتی''۔

اجالا نے دکھ اور کرب سے سوچا آنسوؤں پر اب اختیار نہیں رہا تھا وہ موقع ملتے ہی بہہ نکلے اور وہ روتی ہوئی چینج کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

''شہاب، غزالہ بھابی اجالا بے بی بھی کوئی ہے گھر میں؟ کمال ہے یہاں تو الو بول رہے ہیں۔'' ذیشان، شہاب ولا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور وہاں کسی کو نہ پا کر بولے۔

''ہائے شانی انکل آپ خود کو الو کہہ رہے ہیں''۔ اسی وقت اجالا ہنستی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکلی اور انہیں دیکھ کر شرارت سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر پیار سے بولے۔

''ناٹی گرل آتے ہی انکل کی کلاس لگانی شروع کر دی نہ سلام نہ دعا ...... ہوں''۔

''السلام علیکم انکل''۔ اس نے ان کے قریب آ کر فوراً سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام جیتی رہو کیسی ہو ہماری ڈارلنگ بے بی''۔ انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر پیار سے جواب دیتے ہوئے اس کا حال بھی پوچھا۔

''آپ سے خفا ہے آپ کی بے بی''۔ وہ خفگی سے رخ پھیر کر بولی۔

''ارے کیوں بھئی؟'' انہوں نے حیران ہو کر پوچھا اور اس کا رخ اپنی طرف

کیا۔

''آپ پورے دو دن بعد آئے ہیں''۔

''گڑیا کام تھا آفس میں اس لیے نہیں آسکا مگر فون تو کیا تھا میں نے''۔ وہ اس کی محبت اور معصومیت پر مسکراتے ہوئے نرمی سے بولے۔

''تو فون پر شکل تھوڑی نظر آتی ہے اور نہ ہی آپ مجھ سے پیار کر سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے اور انداز و الفاظ میں بلا کی معصومیت اور بچپنا تھا ذیشان ہنس پڑے اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''پیار تو ہم اپنی گڑیا کو ہمہ وقت کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں رہی بات شکل کی تو ایسے کون سے لعل جڑے ہیں اس شکل میں کے روز روز دیکھنا ضروری ہے''۔

''ہائے اللہ شانی انکل ایسے نہیں کہتے اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں اللہ میاں نے تو اتنی پیاری شکل دی ہے آپ کو فلموں کے ہیرو بھی آپ کے سامنے زیرو ہیں۔ آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے ناشکری اللہ کو اچھی نہیں لگتی''۔ اس نے تیزی سے کہا۔

''استغفر اللہ اللہ مجھے معاف کرے میں تو مذاق میں یہ بات بھول ہی گیا تھا شکر ہے اللہ کا کہ اس نے مجھے اتنی پیاری شکل و صورت سے نوازا، اور اجالا گڑیا تمہارا بھی شکریہ کے تم نے مجھے میری غلطی سے آگاہ کیا۔'' وہ فوراً سنجیدہ ہو کر بولے۔

''اسی خوشی میں میری چاکلیٹ نکالیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور اپنا دایاں ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔

''بچے چاکلیٹ کھا کھا کر اپنے دانت خراب کر لیتے ہیں تمہیں بھی چاکلیٹ کم کھانی چاہیے ورنہ دانت خراب ہو جائیں گے''۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کوئی نہیں ہوتے میرے دانت خراب ابھی تک تو نہیں ہوئے دیکھیں تو کیسے چمک کرتے جھلمل موتی جیسے دانت ہیں میرے''۔ وہ بتاتے ہوئے انہیں اپنے دانت بھی دکھانے لگی تو وہ بے اختیار ہنس پڑے۔ اسی وقت غزالہ ڈرائنگ روم میں

داخل ہوئیں۔

''ذیشان بھائی آئے ہیں تبھی اجالا کی ہنستی مسکراتی آواز گھر میں گونج رہی ہے''۔

''السلام علیکم بھابی''۔انہوں نے احتراماً کھڑے ہوکر انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام کیسے ہو ذیشان؟''

''کرم ہے اللہ کا آپ سنائیں یہ ہمارے شہاب میاں کہاں ہیں؟''

''شہاب میاں تو ہمارے ہیں تمہارے تو دوست ہیں باہر گئے ہیں ابھی آتے ہوں گے''۔غزالہ نے مسکراتے ہوئے بتایا وہ ان کے جملے پر ہنس پڑے تھے۔

''شانی انکل میرے چاکلیٹ''۔وہ ان کے صوفے کے بازو پر بیٹھ کر بولی۔

''یہ رہے''۔انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں سے دو عدد چاکلیٹ باہر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''انہیں کھانے کے فوراً بعد تم نے دانت برش کرنے ہیں''۔

''کس کے دانت؟'' وہ شرارت سے بولی۔

''اپنے اور کس کے جاؤ''۔وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر ہنستے ہوئے بولے تو وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ذیشان مت اٹھایا کرو اس کے ناز نخرے یہ لڑکی ہے اور لڑکیوں کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہیے۔'' غزالہ نے سنجیدگی سے کہا تو چاکلیٹ کا ریپر کھولتی اجالا بولی۔

''مما میں سر پر تو نہیں چڑھی صوفے پر چڑھی ہوں''۔

ذیشان ہنس دیئے۔

''تمہارا لاڈ پیار اسے بگاڑ دے گا شانی، اگلے گھر جائے گی تو اسے مشکل ہوگی کیا خبر سسرال کیسا ملے، اتنا پیار اسے وہاں ملے یا نہ ملے؟''

''بھابی جان اول تو ہماری گڑیا رانی لاڈ پیار سے بگڑنے والی نہیں ہے یہ تو پیار کے بدلے میں پیار دینے والی بچی ہے اور رہی بات سسرال کی تو انشاء اللہ ہم اپنی ڈارلنگ بے بی کے لیے ایسا سسرال ڈھونڈیں گے جہاں اسے پیار ہی پیار ملے۔

ایسا جیون ساتھی تلاش کریں گے اس کے لیے جو اس کو بہت لاڈ پیار سے رکھے اس کے ناز نخرے اٹھائے''۔وہ چاکلیٹ کھانے میں مگن اجالا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یقین سے بولے۔

''کہاں سے ڈھونڈیں گے ہم اس کے لیے ایسا اچھا بر۔'' غزالہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''آپ کیوں فکر کرتی ہیں بھابی وقت آنے پر سب کچھ ہوجائے گا اور ابھی تو ہماری گڑیا بہت چھوٹی ہے میں اپنی گڑیا کے لیے ڈھونڈوں گا چاند چہرے ستارہ آنکھوں والا شہزادہ''۔انہوں نے بہت یقین اور اعتماد سے کہا۔

''مجھے نہیں کرنی کسی شہزادے سے شادی شہزادے وہ تو صرف حکم چلاتے ہیں کام وام کرتے نہیں ہیں''۔اجالا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا وہ دونوں ہنس پڑے۔پھر ذیشان نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہماری گڑیا کو کام کرنے والے لوگ پسند ہیں''۔

''جی آپ کے جیسے جو کام بھی بہت کرتے ہیں مجھے پیار بھی بہت کرتے ہیں مجھے آئس کریم بھی کھلاتے ہیں چاکلیٹ بھی لاتے ہیں اور نخرے بھی کر اٹھاتے جتاتے بھی نہیں ہیں''۔اس نے انہیں محبت اور معصومیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''او گڑیا بیٹا تم نے تو میری شان میں پورا قصیدہ پڑھ دیا۔یعنی اب مجھے تمہارے لیے اپنے جیسا بندہ ڈھونڈنا پڑے گا''۔وہ خوشی سے ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے آپ کے جیسا تو کوئی اور ہوگا ہی نہیں''۔وہ بڑے یقین سے بولی تو وہ اس کی محبت پر خوشدلی سے ہنس دیئے۔

''سن رہے ہو کتنا چاہتی ہے یہ تمہیں''۔غزالہ نے ذیشان کی طرف دیکھا۔

''بھابی میری خوش نصیبی ہے یہ تو''۔وہ اجالا کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولے وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

''اپنے سگے رشتے داروں، کزنز وغیرہ سے اس کی ذرا دوستی نہیں ہے مگر تم سے

تو یہ میری ہر بات شیئر کرتی ہے۔ گھر کے فرد کی طرح ہو تو ہمارے لیے لیکن اجالا کو تم نے اپنا بہت عادی بنا دیا ہے بعد میں بہت مشکل ہو گی اجالا کو“۔

”بھابی جان بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی اب ہم بعد کی فکر میں اپنی گڑیا سے پیار کرنا ہی چھوڑ دیں نہ بابا نہ کم از کم میرا دل تو اس ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ سچ پوچھیں تو میں اس گڑیا رانی کی وجہ سے ہی روز ٹائم نکال کر یہاں آ جاتا ہوں ورنہ آپ اور آپ کے میاں جان تو اکثر مصروف ہی نظر آتے ہیں“۔ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”اچھا تو یہ پیٹھ پیچھے ہماری برائی کر رہے ہو تم“۔ شہاب کی آواز پر وہ گردن گھما کر بولے۔

”نہیں میں تو سامنے بھی یہ برائی کر سکتا ہوں آ رہے ہیں موصوف ساری دنیا کے دھندے نبٹا کر“۔

”ہاں تو تمہاری طرح فارغ تھوڑی ہوں“۔ شہاب نے ہنس کر جملہ کہا۔

”بالکل بجا فرمایا آپ نے میں تو مکھیاں مارتا پھرتا ہوں ناں۔“ وہ خفا ہو کر بولے۔

”واقعی مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔“ شہاب نے انہیں مزید چڑایا۔

”دیکھ لیں بھابی یہ عزت افزائی ہو رہی ہے آپ کے گھر میں میری جا رہا ہوں میں یہاں سے وہ تو میں گڑیا کی وجہ سے آ جاتا ہوں تو اس بہانے آپ لوگوں کو بھی مجھ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا ہے ورنہ کام مجھے بھی بہت ہیں“۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ غزالہ اور شہاب ان کے اس خفا خفا انداز پر ہنس پڑے تھے۔

”شانی انکل ...... شانی انکل ابھی مت جائیں میں نے آپ کے لیے چکن رول اور سینڈوچز بنائے ہیں“۔ اجالا کی آواز پر وہ مسکراتے ہوئے پلٹے اور شہاب کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے فخریہ لہجے میں بولے۔

”دیکھا اسے کہتے ہیں دوستی میری ننھی دوست کو میرا کتنا خیال ہے ایک تم ہو

مروتاً بھی چائے پانی کا نہیں پوچھا الٹا یہاں سے جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ میری یہ بے بی نہ ہو تو تم تو مجھے سوکھا پھیکا ہی ٹرخا دو ہمیشہ“۔

”یار مذاق بھی نہیں سمجھتے جس طرح اجالا کو تم عزیز ہو اسی طرح ہمیں بھی ہو چلو اب بیٹھو اور منہ پر بارہ مت بجاؤ“۔ شہاب نے ہنس کر ان کے شانوں کے گرد بازو حمائل کر کے کہا۔

”یہ میرا منہ ہے ٹائم کلاک نہیں ہے“۔ ذیشان نے منہ بنا کر کہا تو سب کو ہنسی آ گئی اور پھر ذیشان نے چکن رول اور سینڈوچز کھاتے ہوئے اجالا کی خوب تعریف کی اور اتنی مزیدار تواضع پر اس کا بڑی محبت سے شکریہ ادا کیا اور وہ خوشدلی سے ہنس دی۔

نواب علی کے تین بیٹے تھے۔ افراسیاب، زریاب اس کے بعد بیٹی نایاب اور سب سے چھوٹے بیٹے شہاب تھے۔ شہاب چونکہ اپنی بہن کے بعد آخری اولاد تھے۔ نواب علی کی اور ان سے پانچ برس چھوٹے بھی تھے۔ اس لیے نواب علی اور بیگم نواب علی کے بے حد عزیز تھے۔ بیگم نواب علی کا انتقال اس وقت ہوا جب شہاب صرف سات برس کے تھے۔ باقی بچے سمجھدار تھے۔ سنبھل گئے مگر شہاب بہت دلگیر اور رنجیدہ رہنے لگے۔ نواب علی نے انہیں بہت محبت سے پروان چڑھایا بیٹیوں کی شادیاں وہ اپنی بیوی کی زندگی میں ہی کر چکے تھے۔

نایاب بیس برس کی ہوئی تو اس کی شادی بھی کر دی۔ انہیں اب شہاب کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ نواب علی کو ڈاکٹروں نے کینسر بتایا تھا اور تب سے وہ شہاب کے بارے میں بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے دونوں ہی لاپرواہ اور بزنس مائنڈڈ تھے۔ انہیں شہاب کی کوئی پرواہ تھی نہ ہی انہوں نے کبھی اسے وقت دیا تھا بس رسمی سی ملاقات تھی بھائیوں میں اور یہ لاتعلقی نواب علی کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔

شہاب ابھی بی۔ ایس۔ سی فائنل ائیر میں تھے اور نواب علی ان کی شادی کر دینا

چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے بڑے بیٹوں کے رویے نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ وہ شہاب سے ان کی شادی کا ذکر کرتے تو وہ ہنس کر ٹال جاتے۔ نواب علی کو خاندان میں شہاب کے جوڑ کی کوئی لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سو انہوں نے ایک دن شہاب سے کہہ دیا۔

”شہاب بیٹا میری زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں ہی گھر بار والے ہو جاؤ۔ تمہارے بھائی بہن تمہیں پوچھیں گے نہیں انہیں تو بس دو اور دو چار کرنے کا جنون ہے روپے پیسے کے سامنے انہیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں نے اور تمہاری ماں نے ان کی ایسی تربیت تو نہیں کی تھی نجانے کس پر چلے گئے وہ“۔

”بابا جان پلیز آپ دکھی مت ہوں میں ہوں ناں آپ کا بیٹا آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا“۔ شہاب نے ان کے ہاتھ تھام کر سعادت مندی سے کہا۔

”بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم شادی کر لو“۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے، لہجے میں نقاہت تھی۔

”جس سے تمہارا دل چاہے“۔ وہ مسکرا کر بولے۔

”اور جو لڑکی تمہیں دل سے چاہے“۔

”مگر ایسی لڑکی کہاں ہوگی بابا جان؟“ وہ ہنس پڑے بولے۔

”یہیں کہیں ہوگی ضرور ہوگی جو میرے بیٹے کے نصیب کا ستارہ ہوگی تم نظر دوڑاؤ ضرور ملے گی۔ بس بیٹا جلدی کرنا میرے پاس وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے“۔

”پلیز بابا جان ایسی باتیں مت کریں ورنہ میں رو پڑوں گا“۔ وہ روہانسے ہو کر بولے۔

”نہ میرے بیٹے مرد رویا تھوڑی کرتے ہیں اور ہاں میں نے اپنی وصیت لکھوا دی ہے وہ تمہارا انمول سا دوست ہے نا ذیشان احمد اس کے والد بیرسٹر فیضان احمد کے پاس سے میرا وصیت نامہ میں نے تمہارے نام گارمنٹ فیکٹری کر دی ہے کچھ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی ہے اور ایک نئی کوٹھی بھی لی ہے تمہارے نام یقیناً

تمہیں پسند آئے گی اس کے بارے میں فی الحال بیرسٹر فیضان احمد کے تمہارے کسی کو علم نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کی بھنک بھی پڑے ورنہ تمہارے بھائی اس پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ تم اپنی دلہن کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جانا“۔ وہ بولتے بولتے تھک گئے تو شہاب ان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگے۔ انہیں شہاب کا کتنا خیال تھا وہ ان کی آئندہ زندگی کو معاشی طور پر مضبوط اور محفوظ کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ شہاب کا دل باپ کی محبت سے بھر گیا۔

شہاب اپنے ایڈمشن فارم جمع کرانے آفس کے باہر موجود تھے لڑکے لڑکیوں کا بے پناہ رش تھا۔ جبھی ان کی نظر اپنے سے ذرا فاصلے پر کھڑی فرسٹ ائیر کی ایک نازک سی لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی اپنا فارم جمع کرانے آئی تھی اور رش کے باعث خاصی پریشان کھڑی تھی۔ گرمی سے اس کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کے قطرے دمک رہے تھے۔ نجانے کیا بات تھی اس کے چہرے میں کہ شہاب چند سیکنڈ کو تو اپنے کھڑے رہنے کا مقصد بھی بھول گئے اور اسی کو دیکھتے گئے۔ جبھی اس لڑکی کی دوست نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”چلو غزالہ تھوڑی دیر بعد آ جائیں گے یہاں تو تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے“۔

”ہاں چلو“۔ وہ بھی بیزار ہو کر جانے کے لیے مڑ گئی۔

”چلی گئی پری پیکر اب واپس آ جاؤ شہاب علی ورنہ کام سے جاؤ گے“۔ ذیشان نے ان کا بازو ہلاتے ہوئے کہا تو وہ بری طرح چونک گئے اور پھر ذیشان کی شکل دیکھ کر ہنس پڑے۔

”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم بھی میرے ساتھ آئے ہو“۔ شہاب نے ذیشان سے کہا جو میٹرک کے امتحان دے کر فارغ تھا اور کالج دیکھنے کے شوق میں شہاب کے ساتھ چلا آیا تھا۔

”میں انکل کو بتاؤں گا کہ بھابی مل گئیں ہیں“۔ وہ شرارت سے بولے ان سے اور وہ پانچ برس چھوٹے تھے لیکن ہمسائے تھے اس لیے دوستی شروع سے ہی تھی اور

خوب تھی اس کے باوجود کے دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا وہ ان کی ہر بات سے، پریشانی سے واقف تھے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ نواب علی آج کل شہاب کی شادی کے سلسلے میں فکرمند ہیں اسی لیے انہوں نے شہاب کی اس حرکت کو بطور خاص نوٹ کیا تھا۔

''ابھی سے بھابی...... چند لمحے ہی تو دیکھا ہے۔'' شہاب ہنس کر بولے۔

''فی الحال اتنا دیکھنا ہی کافی ہے ساری زندگی پڑی ہے دیکھنے کو۔'' ذیشان نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو شہاب نے قہقہہ لگانے کے ساتھ ساتھ ان کی کمر پر ایک مکا بھی رسید کر دیا۔

''ایکیوزمی پلیز جگہ دیجیے گا''۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اپنا فارم جمع کرا رہے تھے تو غزالہ کی آواز پر انہوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولے۔

''جی ضرور جگہ ہی جگہ ہے آپ آئیں تو سہی''۔

''آ...... ہم۔'' ذیشان نے ان کے کہنی مار کر انہیں موقع کی نزاکت کا احساس دلایا وہ خجل ہو گئے۔

''جی''۔ غزالہ نے ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا۔

''لائیے میں آپ کا فارم جمع کرا دوں آپ پھنس جائیں گی رش میں۔'' شہاب نے اخلاقاً کہا۔

''پھنس تو یہ گئی ہیں''۔ ذیشان کی معنی خیز سرگوشی ان کے کان کے قریب ابھری۔ انہوں نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی ان کے بڑھے ہاتھ دیکھ کر غزالہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ فارم ایک اجنبی کے حوالے کرے یا نہ کرے اس کی دوست نے اسے آہستگی سے کہا۔

''کیا سوچ رہی ہو دے دو اور نکلو یہاں سے ہم تو شام تک کھڑی رہیں گی لو میرا فارم بھی پکڑو۔'' غزالہ نے اپنا اور اپنی سہیلی کا فارم شہاب کو دے دیا۔ انہوں نے فارم اور فیس جمع کرا کے رسیدیں انہیں لا کر دے دیں تو انہوں نے شہاب کا

شکریہ ادا کیا اور گیٹ کی جانب چل دیں۔ شہاب نے غزالہ کا ایڈریس فارم سے دیکھ کر نوٹ کر لیا تھا۔

گھر آنے کے بعد انہوں نے نواب علی کو اپنی پہلی نظر کی پسند سے آگاہ کیا غزالہ کا ایڈریس ان کے ہاتھ پر رکھا اور معاملہ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ نواب علی نے غزالہ کے والدین سے ملاقات کی وہ دونوں بہت ملنسار اور شریف انسان تھے۔ غزالہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس سے بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ بس دو بچے تھے ان کے۔ غزالہ کے والد سرکاری محکمے میں سترویں گریڈ کے آفیسر تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔

نواب علی کو غزالہ اور اس کے گھر کے لوگ بہت پسند آئے۔ انہوں نے شہاب علی کے رشتے کی بات کی تو پہلے تو وہ لوگ بہت حیرت زدہ ہوئے پھر شہاب کی ملازمت نہ ہونے کا سوال اٹھایا اور جب نواب علی نے انہیں بتایا کہ وہ نواب گروپ اینڈ کمپنی کے مالک ہیں اور شہاب ٹیکسٹائل مل ان کے بیٹے کی ہے تو انہیں اطمینان ہوا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیٹی کے لیے اتنے امیر گھرانے سے رشتہ آیا ہے۔

تھوڑی پس و پیش کے بعد انہوں نے غزالہ کے رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ مگر اتنی جلدی شادی کرنے کے حق میں وہ نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ غزالہ اور شہاب پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لیں اس کے بعد شادی ہو۔ مگر جب نواب علی نے ان کے سامنے اپنی بیماری اور مجبوری کا ذکر کیا تھا تو ناچار انہیں ماننا پڑا۔ نواب علی نے وعدہ کیا تھا کہ غزالہ کی تعلیم شادی کے بعد جاری رہے گی۔ اسے پڑھنے سے کوئی نہیں روکے گا۔

یوں یہ رشتہ طے ہو گیا اور جب اس کی خبر شہاب کے بھائیوں، بھابیوں اور بہن کو ملی تو سب نے حیرت اور غصے کا اظہار کیا۔ انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ انہیں سارے معاملے سے لاتعلق رکھا گیا اور اوپر سے غیر خاندان کی لڑکی شہاب کے لیے پسند کی گئی ہے۔ افراسیاب اور زریاب نے تو اپنے بزنس فرینڈز کے گھروں میں ہی

شہاب کے لیے لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں وہ شہاب کے ذریعے اپنے بزنس میں مزید اضافہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اس خبر سے ان کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

''بابا جان آخر اتنی جلدی کیا ہے اس کی شادی کی ابھی تو اس نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی بیوی کو کہاں سے کھلائے گا؟'' افراسیاب نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''جہاں سے تم اپنی بیوی بچوں کو کھلا رہے ہو اور میری بیماری تم لوگوں سے ڈھکی چھپی نہیں ہے میں نے تم سب کو اپنے گھر بار بیوی بچوں کا ہوتے دیکھ لیا ہے اب میں شہاب کو بھی اپنی زندگی میں ہی گھر والا بنتے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' نواب نے مدھم آواز میں کہا۔

''گھر والا بننے کے لیے کمانا بھی پڑتا ہے بابا جان''۔ زریاب نے کہا۔

''ہاں تو میرا بیٹا بھی وقت آنے پر کمائے گا ابھی میں زندہ ہوں اور جتنا میری دولت و جائیداد پر تمہارا حق ہے اتنا ہی شہاب کا بھی ہے تمہیں اس کے معاشی مسائل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھائی کی شادی کی تیاری کرو''۔ نواب علی نے رعب و دبدبے میں کہا۔

''بابا جان آپ نے ہم سے پوچھنا، مشورہ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا اور ہم ایک غیر خاندان کی لڑکی کو اس گھر میں نہیں لا سکتے۔ نایاب نے کہا۔

''یہ غیر خاندان کیا ہوتا ہے سب آدم کی اولاد ہیں ایک نبی کی امت ہیں الحمد للہ ہم اور وہ مسلمان ہیں اور رشتے جوڑنے کے لیے مسلمان گھرانے کا ہونا ضروری ہے سو غزالہ بیٹی جب شہاب کی دلہن بن کر آجائے گی تو اس خاندان کا حصہ بن جائے گی۔ غیر نہیں رہے گی۔'' نواب علی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سب خاموش ہو گئے۔ یوں شہاب اور غزالہ کی شادی دو ماہ کے اندر اندر ہو گئی۔ شادی میں شہاب کے بھائیوں اور بہن نے بے دلی سے شرکت کی اور ان سے لاتعلق ہو گئے۔ غزالہ نے جب شادی کی پہلی رات شہاب کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔

''آپ......؟'' وہ بس یہی کہہ سکی۔

''جی میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ جگہ ہی جگہ ہے آپ آئیں تو سہی اس دل میں۔'' شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا تو غزالہ خوشی اور شرم سے مسکراتے ہوئے سر جھکا گئی۔

غزالہ اور شہاب کچھ عرصے نواب لاج میں رہنے کے بعد شہاب ولا شفٹ ہو گئے کیونکہ شہاب کے بھائیوں اور بھابیوں کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا وہ غزالہ کو مڈل کلاس اور غیر خاندان کی لڑکی ہونے کا طعنہ دیتے تھے اور شہاب سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ نواب علی نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ اپنے نئے بنگلے میں شفٹ ہو جائیں۔

شادی کے پہلے سال ہی غزالہ نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا۔ ڈلیوری کم عمری کی وجہ سے خاصی پیچیدہ ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکیں گی۔ غزالہ تو یہ سن کر بہت روئیں مگر شہاب نے ان کی ہمت بندھائی۔ وہ غزالہ سے بہت محبت کرتے تھے اور غزالہ بھی ان کو بے حد چاہتی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ شہاب بیٹے کی خواہش میں دوسری شادی نہ کر لیں اور شہاب نے ان کے اس اندیشے کو بھی بہت محبت سے سمجھ کر دور کر دیا۔ دونوں کی محبت بہت مثالی تھی۔ نواب علی نے ان کی بیٹی کا نام اجالا رکھا جو سب کو بہت پسند آیا۔

''بھابی آپ کے گھر آنگن کے لیے یہ ایک گڑیا ہی بہت ہے اس کا اجالا ہی آپ کے آنگن کو روشن رکھے گا۔ خدا اسے تندرست اور سلامت رکھے آپ دکھی نہ ہوں اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کو اتنی پیاری بیٹی سے نوازا ہے اور فیملی پلاننگ والوں کا بھی کچھ بھلا ہو گیا ہے۔'' ذیشان نے غزالہ کو روتے دیکھ کر کہا تو وہ بے ساختہ ہی مسکرا دیں۔

وقت گزرتا رہا غزالہ، شہاب اور ذیشان نے اپنی اپنی تعلیم مکمل کی۔ نواب علی کا انتقال، اجالا کی پیدائش کے ایک سال بعد ہی ہو گیا تھا۔ ذیشان نے ایم۔ بی۔ اے

کیا تھا اور شہاب نے بھی بی۔ ایس۔ سی کے بعد اپنا بزنس سنبھال لیا تھا۔ ان کے بھائیوں اور بہن نے نواب علی کے انتقال کے بعد ان سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا تھا۔ انہیں شہاب کے نام فیکٹری کا جب علم ہوا تو وہ بہت تلملائے تھے حالانکہ اپنے حصے کی جائیداد وہ سمیٹ چکے تھے۔ مگر پھر بھی طمع نہیں جاتی تھی۔

ذیشان احمد نے ایم۔ بی۔ اے کے بعد پہلے ایک پرائیوٹ کمپنی میں جاب کی۔ اس کے بعد انہیں ان کے والد فیضان احمد نے اپنی زمین بیچ کر فیکٹری لگوادی۔ اس فیکٹری میں اعلیٰ معیار کا الیکٹرونکس کا سامان تیار ہوتا تھا اور بیرون ملک بھی ذیشان انڈسٹری کی معلومات کی مانگ بڑھ رہی تھی۔ ذیشان بہت محنت سے کام کرتے اور ورکرز سے کام لیتے تھے۔ بزنس کی مصروفیت اور محنت نے انہیں گھر بسانے کا موقع دیا نہ ہی انہوں نے کبھی اپنی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا وہ مزاجاً بہت نرم، ہمدرد، محبت کرنے اور محبتیں بانٹنے والے ایک مخلص انسان تھے۔

شہاب سے ان کی دوستی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید مضبوط ہوتی چلی گئی اور اجالا میں تو جیسے ان کی جان تھی جب تک وہ اسے دیکھ نہیں لیتے تھے اس کے ساتھ کھیل نہیں لیتے تھے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ روزانہ شام کو فیکٹری اور اس کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر گھر واپسی پر وہ شہاب ولا کا چکر ضرور لگاتے تھے خواہ دس پندرہ منٹ کے لیے ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔ وہ اجالا کی معصوم صورت دیکھنے کے لیے شہاب ولا ضرور رکتے تھے۔ شہاب اور غزالہ کے لیے بھی ذیشان سگے بھائیوں جیسے ہی تھے۔ غزالہ بھی بزنس میں شہاب کا ہاتھ بٹانے لگیں تھیں۔

اجالا شروع ہی سے بہت ذہین تھی۔ اس پر مما، پاپا اور شانی انکل کی توجہ نے اسے اور بھی تیز بنا دیا تھا۔ اس کی فطری معصومیت اور بچپنا اپنی جگہ تھا مگر وہ اپنی تعلیم میں بہت آگے تھی اور ذیشان سے تو اسے بھی بے حد انس تھا۔ جس دن وہ نہ آ سکتے تو اسے فون کر لیتے یا وہ خود انہیں فون کر لیتی۔ ان کے بغیر اسے بھی چین نہیں ہوتا تھا۔

گھر میں شانی انکل، شانی انکل کا ورد ایسے ہوتا تھا جیسے ہمہ وقت وہ یہیں موجود ہوں۔ اجالا ذیشان سے پڑھتی، ان کے ساتھ کیرم، لڈو، شطرنج کھیلتی، ذیشان

سے آئس کریم کھانے اور چاکلیٹ دلوانے کی فرمائش اس کی ہمیشہ قائم رہتی اور ذیشان اس کے لیے خریداری کر کے خوش ہوتے تھے۔ شہاب اور غزالہ ان کی دوستی اور محبت دیکھ کر کبھی کبھی ہنس کر کہتے۔

''ذیشان تم نے ہماری بیٹی کو ہم سے چھین لیا ہے''۔

''میں نے کہاں چھینا ہے یہ تو شروع دن سے ہی میری ہے، ہے نا گڑیا؟''

ذیشان جواب دیتے اور ساتھ ہی اجالا سے اپنی بات کی تصدیق بھی چاہتے تو وہ ہنس پڑتی۔

ذیشان سے چھوٹی ان کی ایک ہی بہن تھی شہلا جس کی بی۔ اے کرتے ہی شادی کر دی گئی۔ وہ اب اپنے شوہر اور دو عدد بچوں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھی۔ شہلا کا جب وہ فون آتا وہ خط لکھتی تو ذیشان سے شادی کرنے پر اصرار کرتی۔ اب تو فیضان صاحب اور ذیشان کی امی صفیہ بیگم بھی بہت زور دینے لگے تھے۔ ان سے شادی کرنے کے لیے اور وہ تھے کہ ہمیشہ بچ نکلتے تھے۔ خاندان اور خاندان سے باہر ان کی نظر میں کوئی لڑکی جچی ہی نہیں تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ انہوں نے کبھی کسی لڑکی کو اپنی شریک حیات کے خیال سے دیکھا ہی نہ تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ ذیشان نہا کر تیار ہوئے اور شہاب ولا پہنچے تو شہاب غزالہ اور اجالا کو باہر جانے کے لیے تیار کھڑے پایا۔

''شانی انکل السلام علیکم''۔ اجالا انہیں دیکھتے ہی خوشی سے بولی اور ان کے قریب آ گئی۔

''وعلیکم السلام خوش رہو ماشاء اللہ میرون رنگ پہن کر تو ہماری گڑیا حوروں سے کم نہیں لگتی۔ شہاب نظر اتاری تم نے ہماری بے بی کی۔'' ذیشان نے اجالا کے حسین و جمیل سراپے پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو اجالا اپنی تعریف پر خوشی سے مسکرانے لگی۔

''نہیں تم جو آ گئے ہو نظر وٹو کے طور پر''۔ شہاب نے ان کی کھلی کھلی گندمی رنگت

کو نشانہ بناتے ہوئے مذاق سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بچوں کی طرح منہ بنا کر بولے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا میں کوئی کالا ہوں اچھی خاصی صاف رنگت ہے میری''۔

''ہے نہیں تھی کام کر کر کے اپنا رنگ خراب کر لیا ہے تم نے''۔

''خیر اجالا گڑیا کے ساتھ کھڑے ہو کر میں بھی اجالا جیسا لگتا ہوں''۔ وہ اترائے۔

''اچھا ہمیں تو دیر ہو رہی ہے آج تم اکیلے ہی بیٹھو ہمیں اپنے ایک جاننے والے کے ہاں جانا ہے چائے پر مدعو کیا ہے اس نے''۔ شہاب نے کہا۔

''تو جاؤ بڑی جلدی ہے تمہیں جانے کی، اجالا میرے ساتھ جائے گی کیونکہ میں نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ جونہی اجالا ایف۔ ایس۔ سی کا آخری پرچہ دے کر فارغ ہوگی میں پورے دن کے لیے اسے آپ کے پاس لاؤں گا اور اجالا نے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا یاد ہے نا گڑیا؟'' ذیشان کہتے ہوئے اجالا کو بھی یاد کروایا۔

''جی شانی انکل''۔ اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا وہ پیار سے بولے۔

''تو چلو گڑیا امی تمہارا انتظار کر رہی ہیں اور تمہاری فیورٹ آئس کریم اور چاکلیٹ میں تمہیں راستے میں سے خرید دوں گا ٹھیک''۔

''جی''۔ وہ خوشی سے مسکرائی۔

''تم نے اسے ابھی تک سات سال کی بچی بنایا ہوا ہے اس کو اتنا پیار کرتے ہو اس کی اتنی کیئر کرتے ہو اپنی اولاد کو تو تم کتنا چاہو گے''۔ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو شہاب نے بھی ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ اپنے بچوں کا بہت ہی اچھا باپ ثابت ہوگا''۔

''بشرطیکہ بیوی والا بن گیا تو''۔ ذیشان نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ دونوں بھی ہنس دیئے۔

''یار اب کرلو شادی کب تک کنوارے رہو گے؟'' شہاب نے کہا۔

''جب تک اللہ چاہے گا مگر یہ طے ہے کہ اجالا کا نمبر تب بھی پہلا ہی ہوگا اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا یہ چاندی گڑیا تو میرا پہلا پیار ہے''۔ ذیشان نے اجالا کو بہت محبت اور شفقت سے دیکھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دل سے کہا تو وہ مسکرا گئی۔

''تمہاری بیوی تو اجالا سے بہت جیلس ہوگی تب کیا کرو گے؟'' غزالہ نے ہنس کر پوچھا۔

''میں بیوی بھی اپنے جیسی ڈھونڈوں گا لونگ کیئرنگ''۔

''کس کے لیے اپنے لیے یا اجالا کے لیے لونگ کیئرنگ؟'' شہاب نے شرارت سے کہا۔

''دونوں کے لیے''۔ وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولے اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''چلو بھئی دیر ہو رہی ہے اس نے تو رات یہیں کر دینی ہے''۔ شہاب نے گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈال کر غزالہ سے کہا تو ذیشان فوراً بولے۔

''اجالا میرے ساتھ جائے گی''۔

''یار کل لے جانا آج ہمارے ساتھ جانے دو''۔

''کل کی کل دیکھی جائے گی کل بھی لے جاؤں گا لیکن آج تمہارے ساتھ تو تمہیں جانے نہیں دوں گا اسے''۔ ذیشان نے اجالا کے شانوں پر اپنا بازو رکھ کر حتمی لہجے میں کہا۔

''مان جا یار جانے دے۔'' شہاب نے پیار سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔

''دل مانے تو مانوں ناں میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ آج میں اپنی گڑیا کے ساتھ خوب سیر کروں، کھیلوں، باتیں کروں اور امی کو بھی ساتھ شریک کروں پھر تجھے کیا تکلیف ہے تم نے جانا ہے تم جاؤ گڑیا رانی تو اپنے انکل شانی کے ساتھ ہی جائے گی''۔ ذیشان نے مسکراتے ہوئے بڑے آرام سے کہا۔

''تم انکل شانی نہیں اس وقت انکل شیطانی لگ رہے ہو''۔

''نہیں پاپا انکل شانی بہت اچھے ہیں''۔ اجالا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں سن لیا۔'' ذیشان نے خوش ہو کر کہا تو وہ ہنس دیئے۔

''سن لیا دوست یہ تمہارا پیار بول رہا ہے چلو جاؤ تم بھی کیا یاد کرو گے''۔ شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ذیشان کو ہار ماننا نہیں آتا تھا یہ وہ جانتے تھے اس لیے مزید بحث وتکرار مناسب نہیں سمجھی۔

''تھینک یو پاپا''۔ اجالا نے خوش ہو کر کہا تو انہوں نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

''جیتی رہو بس انکل کو تنگ نہیں کرنا اوکے''۔ وہ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے پیار سے بولے۔

''اور آنٹی کو بھی بالکل پریشان نہیں کرنا اچھا''۔ غزالہ نے اس کے رخسار پر بوسہ دے کر کہا۔

''میں اگر انکل شانی اور آنٹی کو تنگ اور پریشان کرتی تو شانی انکل مجھے لینے تھوڑی آتے میں تنگ تو نہیں کرتی''۔ وہ معصومیت سے بولی۔

''ہاں بھئی اجالا تو بہت اچھی بچی ہے یہ تم لوگ اس قسم کی نصیحتیں کیوں کرنے لگے اسے اسی شہر میں سے ایک دن کے لیے جارہی ہے زندگی بھر کے لیے تھوڑی جارہی ہے جو اس طرح نصیحت کر رہے ہو ویسے بھی ہماری گڑیا بہت سمجھدار ہے یہ تنگ کرنے والی بچی نہیں ہے''۔ ذیشان نے نرمی اور محبت سے کہا۔

''اوکے بیٹا اللہ حافظ''۔ شہاب اور غزالہ نے جاتے جاتے اجالا کا ماتھا چوما، اجالا ذیشان کی گاڑی میں ان کے ساتھ چلی گئی اور شہاب اور غزالہ اپنی گاڑی میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

''شانی انکل بے ایمانی نہیں چلے گی رکھیں گوٹ واپس''۔ وہ ایک گھنٹے سے فیضان لاج میں تھی۔ صفیہ بیگم سے ملنے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ذیشان کے ساتھ لڈو بھی کھیل رہی تھی۔ ان کی بے ایمانی پر اس نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ کر روکتے

ہوئے کہا۔

''گڑیا یہ گوٹ یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے تھوڑی سی واک کرنے دو نا''۔

''جی نہیں''۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ صفیہ بیگم بھی ہنس پڑیں یہ وہ قریب ہی بیٹھی ان کے لیے پھل کاٹ رہی تھیں اجالا انہیں بھی بے حد عزیز تھی وہ بہت چاہتی تھیں اسے۔

''چلو تمہاری بکری تو گئی اپنے گھر پہ میری بکریوں کو کیا ہو گیا؟''

''بکریاں۔'' اجالا نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''گڑیا انگریزی میں بکری کو گوٹ کہتے ہیں ناں؟''

''جی''۔ وہ ان کے اس ترجمے پر ہنس پڑی۔ ذیشان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی نظر اتاری ہنستی مسکراتی ہوئی وہ بے حد حسین لگتی تھی اور لگ رہی تھی۔

''گڑیا جانی لگتا ہے کہ آج میری بکریوں نے ناشتہ نہیں کیا جبھی تو ست کہیں کی ایک ہی جگہ جم کر کھڑی ہیں ہلنے کا نام ہی نہیں لے رہیں''۔

ذیشان نے پرمزاج لہجے میں کہا تو اجالا کی کھنکتی، کھلکھلاتی ہنسی پورے لاؤنج میں گونجنے لگی۔ صفیہ بھی ہنس پڑی۔ ذیشان ایسے ہی بنگلے چھوڑتے رہتے تھے اور سب کو ہنساتے رہتے تھے۔ اسی وقت ذیشان کے موبائل کی بیل بجی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر صوفے پر رکھا موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہیلو''۔

''ذیشان صاحب''۔ دوسری جانب شہاب کا گھریلو ملازم رشید بھرائی آواز میں بولا۔

''ہاں رشید کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' ذیشان وہاں سے اٹھ کر لابی میں آتے ہوئے بولے تو اس نے روتے ہوئے بتایا۔

''ذیشان صاحب آپ کے دوست اور بیگم صاحب اس دنیا میں نہیں رہے''۔

''کیا بک رہے ہو ہوش میں تو ہو تم؟'' ذیشان کی تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی ایک دم سے جھٹکا لگا انہیں چلا کر بولے۔

''صاحب ابھی ہسپتال سے ٹیلی فون آیا تھا بیگم صاحبہ اور شہاب صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ دونوں .....؟'' اتنا کہہ کر رشید رونے لگا اس نے بمشکل انہیں ہسپتال کا نام بتایا۔

''او میرے خدا یہ کیا ہوگیا''۔ ذیشان نے غم سے چور ہو کر ستون کا سہارا لیا۔

''شہاب، غزالہ بھابی کہاں چلے گئے تم لوگ جہاں سے واپسی ہی ناممکن ہے''۔ ذیشان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ انہوں نے دور بیٹھی ہنستی مسکراتی، کھیلتی ہوئی اجالا کو دیکھا تو ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''میں اس معصوم گڑیا کو یہ المناک خبر کیسے سناؤں گا کیا گزرے گی اس پر؟'' ذیشان نے بھیگی آنکھوں سے اجالا کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے لاؤنج کی جانب آئے۔ صفیہ بیگم نے ان کے غمزدہ چہرے کو دیکھا تو اٹھ کر ان کے پاس آئیں۔

''کیا بات ہے کس کا فون تھا شانی بیٹا؟''

''امی شہاب اور غزالہ بھابی ایکسیڈنٹ میں ہلاک''۔

''نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے کس نے کہا تم سے یہ جھوٹ ہے؟'' صفیہ بیگم پر جیسے بجلی گری وہ لرز کر بولیں ذیشان رو پڑے۔

''کاش یہ جھوٹ ہوتا امی مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔ آپ اجالا کو خود ہی یہ خبر سنائیں۔ میں ہسپتال جا رہا ہوں ان کی ڈیڈ باڈیز لینے آپ اجالا کو لے کر شہاب ولا پہنچ جائیں ابو کو میں فون کر دیتا ہوں۔''

ذیشان نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ صفیہ بیگم نے اجالا کی طرف دیکھا جو اس قیامت سے بے خبر کھیلنے میں مگن تھی اسے کیا پتا تھا کہ تقدیر اسی کے ساتھ کیا کھیل کھیل گئی ہے۔ صفیہ بیگم نے ہمت کر کے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس سانحے کا بتایا تو ایک منٹ کو تو اسے سکتہ ہوگیا اور جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ بکھر گئی۔ اس کے ننھے سے دل پر قیامت گزر گئی تھی۔

شہاب ولا میں شہاب اور غزالہ کے رشتے دار بھائی، بہن، بھابیاں، ہمسائے

بھی جمع ہو گئے تھے۔ سب اس المناک سانحے پر آبدیدہ اور رنجیدہ تھے۔ اجالا کو تو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ذیشان اپنے عزیز دوست اور پیاری بھابی کے کفن دفن کے انتظامات میں مصروف تھے۔ فیضان صاحب کی حالت بھی بہت تکلیف دہ تھی۔ انہوں نے شہاب کو ذیشان سے کم نہیں سمجھا تھا۔ انہیں لگا جیسے ان کا بیٹا اور بہو انتقال کر گئے ہیں۔ صفیہ بیگم کی حالت بھی بہت خراب ہو رہی تھی وہ اجالا کو سنبھالتے سنبھالتے خود نڈھال ہو رہی تھیں۔

جس وقت شہاب اور غزالہ کی میتیں تدفین کے لیے لے جائی جانے لگیں تو اجالا کی روح شکن چیخیں ہر شخص کو رلا گئیں۔ تبھی اس ناگہانی موت پر رو رہے تھے۔ شہاب اور غزالہ کے دوست احباب ہمسائے سبھی ان کے حسن اخلاق کی وجہ سے انہیں پسند کرتے تھے اور ان کی یوں اچانک موت سے صدمے میں تھے۔ شہاب بھائیوں، بھابیوں ان کے بچوں اور غزالہ کے اکلوتے بھائی رفیع ان کی بیوی شہناز اور بیٹا سمیع پہنچ گئے تھے۔

اجالا اپنے ان رشتے داروں کو پہلی بار دیکھ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔ رفیع والوں سے تو ایک آدھ بار مل چکی تھی مگر اپنے تایا اور ان کے بیوی بچوں کو پہلی بار دیکھا تھا اس نے۔

''اجالا میری گڑیا سنبھالو خود کو چندا اب تمہیں اپنے مما پاپا کے بغیر ہی جینا ہوگا''۔ ذیشان نے اسے شہاب اور غزالہ کے سرہانے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''نہیں .....نہیں شانی انکل پاپا سے کہیں اٹھیں، مما رک جائیں مما''۔ وہ بلکتے، روتے ہوئے بولی تو ذیشان اسے اپنے سینے سے لگا کر سسک پڑے اور بھیگتی آواز میں آنسو برساتی آنکھوں سے شہاب کے کفن میں لپٹے وجود کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''شہاب یار تم نے اچھا نہیں کیا ہمارے ساتھ بہت جلدی تھی تمہیں ہر کام کی، تمہیں شادی کرنے کی جلدی تھی، باپ بننے کی جلدی تھی اور اس دنیا کو چھوڑ جانے کی بھی تم نے جلدی کی کیسے جیئے گی گڑیا تمہارے اور بھابی کے بغیر کیسے شہاب؟''

''شانی بیٹا سنبھالو خود چلو نماز جنازہ کا وقت ہو رہا ہے''۔ فیضان صاحب نے آگے بڑھ کر انہیں دلاسہ دیا۔ وہ گڑیا کو صفیہ بیگم کے پاس چھوڑ کر اپنے پیارے بھائی جیسے دوست اور بھابی کے جنازے کو کندھا دینے کھڑے ہو گئے۔ شہاب اور غزالہ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عہد نبھا گئے تھے۔ دونوں کی قبریں ساتھ ساتھ بنائی گئی تھیں۔

اجالا رات بھر بے ہوش رہی تھی۔ صبح اٹھتے ہی رونے لگی تھی۔ ذیشان ڈاکٹر کو بلا لائے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے سکون کا انجکشن لگا دیا تھا اور وہ پھر سے سو گئی تھی۔

''بے ہوشی بھی بڑی نعمت ہے صدمے کا اثر وقتی طور پر بھلا دیتی ہے۔'' ذیشان نے اجالا کے بے سدھ سراپے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ہائے ہائے میری نند دل کے ارمان دل ہی میں لے گئی غزالہ تو میرے سمیع سے اپنی اجالا کی بات طے کرنے آ رہی تھی کہ راستے میں موت نے آ لیا۔ ہم تو انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ ہائے میری اجالا یتیم ہو گئی بن ماں کی ہو گئی۔'' غزالہ کی بھاوج شہناز سپارہ پڑھنے کی بجائے آنسو بہاتے ہوئے دہائی دے رہی تھیں۔

صفیہ بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھا وہ کل سے اسی قسم کی باتیں شہاب اور غزالہ کے گھر والوں کی زبانی سن رہی تھیں۔ اتنا تو وہ سمجھ گئیں تھیں کہ وہ سب اجالا کی نہیں اس کی دولت کی فکر میں رہے ہیں۔ وہ سب اجالا کی نہیں اس کی دولت کی فکر میں رہے ہیں۔ وہ سب اجالا کو اپنی بہو بنا کر اس کی فیکٹری، کار، کوٹھی اور بینک بیلنس پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ صفیہ بیگم کو ان کی اس سوچ پر بہت دکھ ہو رہا تھا۔ انہیں اپنی جوان بہن، بھائی کی موت کا کوئی دکھ نہیں تھا بلکہ وہ تو دل ہی دل میں خوش تھے کہ برسوں پہلے جو دولت ان کے ہاتھ نہ آ سکی تھی اب وہ دولت ان کے ہاتھ بہ آسانی لگ سکتی ہے۔ صفیہ بیگم کو رہ رہ کر اجالا کی یتیمی کا، بے بسی کا خیال ستا رہا تھا اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو رہی تھیں۔

''لو یہ خوب کہی تم نے اجالا تو میری بہو بنے گی شہاب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ بڑی بھابی کا حق زیادہ ہے ہم پر ہم تو بچی کی تعلیم کی وجہ سے چپ تھے کہ چلو گھر کی

ہے کسی بھی وقت لڑکے کو لے جا کر دو بول پڑھوا لیں گے مگر میرے پیارے بھیا اور بھابی کو وقت نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کو دلہن بنا دیکھ سکتے۔ اب تو ہم ہی اجالا کے ماں باپ ہیں اس کا خیال رکھنا اب ہمارا ہی فرض ہے ہائے میری بچی اجالا۔'' شہاب کی بڑی بھابی طاہرہ نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھابی چالیسویں تک تو ہمیں یہاں رکنا ہی پڑے گا پھر نکاح کر کے لے جائیں گے اجالا کو۔'' چھوٹی بھابی مریم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کہاں لے جائیں گے یہ مجھے نکاح ابھی میرے مما پاپا کی قبروں کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی اور یہ لوگ بے حس، لالچی مجھے دولت کے لیے لے جانا چاہتے ہیں۔ ذیشان انکل نے ٹھیک کہا تھا ان سے ہوشیار رہنا میں نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ میں تو اپنے مما پاپا کے ساتھ بھی نہیں جا سکی۔ مما، پاپا کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کے''۔

اجالا نجانے کب نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر آئی تو ان کی باتیں سن کر وہیں سے پلٹ گئی اور اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی اور ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ اجالا کا غم تازہ تھا۔ صفیہ بیگم اپنا گھر بار چھوڑے اجالا کے پاس ٹھہری ہوئی تھیں۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ورنہ وہ اجالا کو اپنے گھر لے جاتیں۔ اجالا کے ماموں، مامی ان کا بیٹا سمیع بھی روز چکر لگاتے۔ سمیع تو اجالا سے بات کرنے کی بہت کوشش کرتا مگر وہ چپ بیٹھی رہتی۔ ممانی بہت پیار جتاتیں مگر اسے یہ سب دکھاوا لگتا یہی حال دونوں تایا اور تائیوں اور ان کی اولاد کا تھا۔ سب اسے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے وہ ان سب کی باتیں سن چکی تھی۔ خود بھی اور ملازمہ کے زبانی بھی اس لیے اس کے دل میں ان کے لیے سوائے غصے کے اور کچھ نہیں تھا اور جب سے انہیں پتا چلا تھا کہ شہاب اپنی فیکٹری بنگلہ گاڑی پہلے ہی اجالا کے نام ٹرانسفر کرا چکے تھے تب سے تو وہ اور بھی زیادہ اجالا کے گرد منڈلانے لگے تھے۔

ذیشان بھی روزانہ صبح وشام اجالا کی خیریت معلوم کرنے جاتے۔ اسے پیار سے سمجھاتے۔ تسلی دلاسہ دیتے اس کی ہمت بڑھاتے۔ صفیہ بیگم نے اجالا کا ماں سے بڑھ کر خیال رکھا تھا۔ وہ ان کی بے حد ممنون تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کی نمی تھی کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ وہ مما پاپا کو یاد کر کے دن میں کئی بار روتی تھی۔ نماز پڑھتے وقت تو اس کے آنسو تھمتے ہی میں نہ آتے تھے۔ چالیسویں کے بعد شہاب کی بڑی بھاوج طاہرہ نے شہاب ولا میں ہی ڈیرے جما لیے وہ کسی طرح اپنے بیٹے ناصر سے اجالا کا نکاح کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں صفیہ بیگم کا وہاں رہنا بھی کھٹک رہا تھا۔ اسی روز ناشتے کے بعد وہ بول ہی پڑیں۔

''صفیہ بیگم کیا آپ کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے جو یہاں بیٹھی ہوئی ہیں؟''

''میں اجالا بیٹی کی وجہ سے یہاں ٹھہری ہوئی خدا رکھے میرا گھر بار سلامت ہے''۔ صفیہ بیگم نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ان سے آج تک کسی نے اس لہجے اور انداز میں بات نہیں کی تھی انہیں غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئیں۔

''تو جایئے جا کر اپنا گھر سنبھالیے اجالا کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ میں اجالا کی سگی تائی ہوں ہمارا خون ہے وہ ہم اس کا آپ سے بڑھ کر خیال رکھ سکتے ہیں۔ خیر سے دو دو بھائی ہیں شہاب مرحوم کے ہم سب غیر نہیں اجالا کے لیے آپ کی طرح''۔

طاہرہ نے اپنی بات بہت طنزیہ اور ہتک آمیز لہجے میں مکمل کی اور اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئیں۔ صفیہ بیگم نے اجالا کو پیار کیا اور اپنا سامان سمیٹ کر اپنے گھر چلی آئیں۔

''امی آپ اجالا کو بھی ساتھ لے آتیں وہ وہاں اکیلی ڈرتی ہوگی۔'' ذیشان نے ان کے آنے پر وجہ جاننے کے بعد بے کلی سے کہا تو وہ رنجیدگی سے بولیں

''اکیلی نہیں ہے وہ اس کی تائی موجود ہیں بہت پیار سے بات کرتی ہیں محترمہ اس سے اور اس کے لیے بڑے چاؤ سے کھانا پکوا کر خود کھلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مالکن بن کر حکم چلاتی پھر رہی ہیں طاہرہ بی بی شہاب اور غزالہ کے گھر میں۔ میرا تو

دل پھٹا جاتا ہے اس ہنستے بستے گھر کی ویرانی اور بے بسی دیکھ کر۔''

''امی ان لوگوں کے عزائم سے آپ واقف ہیں اجالا بچی ہے ان کے کہنے میں آ گئی تو بہت برا ہوگا۔ جو کچھ آپ بتا رہی ہیں تو وہ کسی کی بھی بات ماننے پر مجبور ہو سکتی ہے اور امی اگر ایسا ہو گیا تو میں شہاب اور غزالہ بھابی کو قیامت کے روز کیا منہ دکھاؤں گا کیا جواب دوں گا انہیں اور گڑیا کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو امی میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا پلیز امی کچھ کریں اجالا کے لیے وہ سب لوگ اجنبی ہیں ایسے میں ہم بھی اسے اکیلا چھوڑ دیں گے تو، تمہیں امی آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔'' ذیشان بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہے تھے اور صفیہ بیگم انہیں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھیں۔

''اچھا ابھی تو میں آ گئی ہوں کل دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے''۔

''پلیز امی کل تک میں پریشان رہوں گا آپ ابھی کچھ کریں''۔ وہ ان کے ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں بولے تو وہ مسکرا کر بولیں۔

''اپنے ابو کو تو آ لینے دو ان کے مشورے کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی''۔

''ابو کو فون کر کے گھر بلا لیں وہ اپنے چیمبر میں ہی ہوں گے پرسوں انہوں نے اسلام آباد بھی تو جانا ہے کہیں آج ہی نہ چلے جائیں۔'' ذیشان کی پریشانی اور بے کلی عروج پر تھی۔ صفیہ بیگم کو اپنے بیٹے کی حالت پر پیار بھی آیا اور ہنسی بھی۔

''آپ ہنس رہی ہیں؟'' وہ خفگی سے بولے۔

''اپنے بیٹے کی دیوانگی پر''۔ وہ ان کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پیار سے بولیں۔

''میں اجالا کے پاس جا رہا ہوں میں اسے ان حریص اور خود غرض لوگوں میں نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''شانی بیٹا یوں اچھا نہیں لگتا وہاں اس کے سگے رشتے دار موجود ہیں وہ لوگ باتیں بنائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اجالا سے ملنے ہی نہ دیں''۔

''وہ کون ہوتے ہیں مجھے اجالا سے ملنے سے روکنے والے،، انہوں نے شہاب اور غزالہ بھابی کی موت کے بعد اجالا کو دیکھا ہے اور میں اجالا کو اس کی پیدائش کے

دن سے لے کر آج تک اپنوں سے بڑھ کر چاہتا آیا ہوں میرا اجالا پر ان سے کہیں زیادہ حق ہے اور مجھ سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ صفیہ بیگم دیکھتی رہ گئیں۔

''شکر ہے صاحب آپ آ گئے یہاں تو بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے''۔ ذیشان کو دیکھتے ہی شہاب ولا کا پرانا ملازم ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''کیسی گڑبڑ اجالا کہاں ہے؟''

''اجالا بیٹا تو اپنے کمرے میں ہیں صاحب اور آپ کی امی حضور کے جاتے ہی طاہرہ بیگم نے اپنے شوہر اور بیٹے کو بھی فون کر کے بلوا لیا تھا۔ اب وہ سب اجالا بیٹا کے کمرے میں ہیں اور ان کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر بھی دیکھے ہیں میں نے۔'' رشید نے رازداری سے بتایا۔

''مائی گاڈ تو وہ ہی ہو رہا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔'' ذیشان نے پریشانی سے کہا۔

''صاحب آپ اجالا بٹیا کو اپنے گھر لے جائیں یا بیگم صاحبہ کو یہاں لے آئیں ورنہ ان کے لٹیرے تایا کچھ بھی کر سکتے ہیں''۔ رشید کی بیوی شکیلہ نے کہا۔

''ابھی میں زندہ ہوں میں اپنی گڑیا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا تم لوگ ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنا اور مجھے بتاتے رہنا میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' ذیشان نے سنجیدہ اور پراعتماد لہجے میں کہتے ہوئے انہیں ہدایت دی اور آگے بڑھ گئے۔

''اجالا دیکھو بیٹا تمہارے شانی انکل اور ان کی والدہ تمہاری جائیداد ہتھیانے کے چکر میں تھیں۔ میں نے فون پر ان کی باتیں سن لیں ان کی خبر لی تو غصے میں آ کر یہاں سے چلی گئیں۔ غیر تو غیر ہی ہوتے ہیں چاہے کتنی ہی محبت بگھار لیں اپنوں کی جگہ نہیں لے سکتے اور تم تو ہمارا خون ہو سگے بھائی کی اولاد ہو ہم سے زیادہ کون خیال رکھ سکتا ہے تمہارا اس سے پہلے کہ ذیشان اور اس کی ماں تم سے تمہاری جائیداد ہتھیا لیں اور تمہیں فٹ پاتھ پر پہنچا دیں بیٹا ان پیپرز پر دستخط کر دو تمہارے تایا اور

کزن ناصر سنبھال لیں گے بزنس، تم بے فکر ہو کر ہمارے گھر میں رہنا۔'' طاہرہ بیگم بہت دیر سے اسے رام کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ اسے ذیشان کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا کا یہ رنگ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

''میں اپنے ہی گھر میں رہوں گی آنٹی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چلو جیسے تمہاری مرضی ظاہر ہے اتنا بڑا بنگلہ خالی تو نہیں چھوڑا جا سکتا ناں تم اور ناصر شادی کے بعد اسی بنگلے میں رہنا۔'' افراسیاب نے کہا۔

''میں شانی انکل کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی وہ بہت اچھے ہیں''۔ اجالا نے کہا تو طاہرہ پٹ سے بولیں۔

''کیا خاک اچھے ہیں تمہاری دولت ہتھیانا چاہتے ہیں''۔

''اور آپ کسے ہتھیانا چاہتے ہیں مجھے یا میرے پاپا کی اس دولت کو جو انہوں نے اپنی زندگی میں ہی میرے نام کر دی تھی۔'' اجالا نے تلخی سے کہا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

''بیٹا دولت تو آنی جانی شے ہے اور پھر یہ تو ہمارے گھر کی بات ہے اب ظاہر ہے کہ تم سے تو اتنا بڑا بزنس نہیں سنبھلے گا۔ یہ کاغذات ہیں یا نکاح نامے پر دستخط کر دیا پراپرٹی لک آفٹر (دیکھ بھال) کرنے کے راضی نامے پر سائن کر دو جیسے تمہارا دل چاہے ہم کوئی دشمن تھوڑی ہیں تمہارے۔'' افراسیاب نے کاغذات اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ دوست بھی تو نہیں ہیں اجالا کے''۔ ذیشان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے تو وہ سب بوکھلا گئے۔ افراسیاب نے پیپرز فوراً اجالا کے سامنے سے اٹھا لیے اور اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونسنے لگے۔

''انکل شانی''۔ اجالا انہیں دیکھتے ہی ان کے پاس دوڑی چلی آئی۔

''اجالا جانی ڈونٹ وری میں ہوں ناں اپنی گڑیا کے پاس''۔ ذیشان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت محبت اور شفقت بھرے لہجے میں کہا تو اس کی جان میں جان

آئی۔ان کے آنے سے اس کی آدھی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔

''لیجیے ماں نے جاتے ہی بیٹے کو بھیج دیا یتیم کے مال پر کیسی نظر جمی ہے دونوں کی۔'طاہرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ذیشان سپاٹ لہجے میں بولے۔

''آپ دونوں کی نا یاد رکھیے میرے ہوتے ہوئے آپ لوگ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے''۔

''کیسے مقاصد اور مسٹر تم یوں منہ اٹھائے بغیر کسی سے پوچھے اور اجازت لیے بغیر یہاں آئے کیسے؟''افراسیاب نے اپنی بدحواسی اور چوری چھپانے کے لیے غصیلے لہجے میں ان سے استفسار کیا۔

''مجھے اس گھر میں آنے کے لیے کبھی کسی سے پوچھنے اور اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔''ذیشان نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''تم جس کسی کی بات کر رہے ہو نا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے اس لیے تم بھی اب یہاں سے چلے جاؤ تو بہتر ہے۔''افراسیاب نے بڑے حاکمانہ انداز میں کہا۔

''اگر انکل شانی اس گھر میں نہیں آ سکتے تو کوئی بھی اس گھر میں نہیں آ سکتا آپ سب لوگ بھی یہاں سے چلے جائیں''۔اجالا نے ذیشان کا بازو پکڑ کر ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پریشان ہوگئے۔ پھر طاہرہ نے محبت بھرے لہجے میں بات بنائی۔

''ارے گڑیا ہم تو تمہارے آرام کے خیال سے کہہ رہے تھے اب دیکھو نا وقت بے وقت کوئی نہ کوئی منہ اُٹھائے چلا آتا ہے تم آرام بھی نہیں کر سکتیں۔''

''انکل شانی آ گئے ہیں اب میں آرام سے ہوں آپ لوگ جائیں''۔اجالا نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ دل ہی دل میں اجالا کو کوستے ہوئے باہر نکل گئے۔

''نجانے کیا پڑھ کر پھونک رکھا ہے اس انکل شانی نے اس پر ہر وقت اسی کی تسبیح پڑھتی رہتی ہے۔''طاہرہ کی بڑبڑاہٹ کافی بلند تھی ذیشان نے سن لی تھی ان کے جاتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔

''انکل شانی مجھے ڈر لگتا ہے ان لوگوں سے یہ آپ کے خلاف مجھے بھڑکانے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں نے یقین نہیں کیا ان کی کسی بات کا آپ تو سب سے اچھے ہیں''۔

''خوش رہو گڑیا''۔انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا۔

''ان لوگوں نے امی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اس لیے وہ یہاں سے چلی گئیں۔تم گھبراؤ نہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بس اپنا دل مضبوط رکھو اور دیکھو اپنا کمرہ اندر سے لاک رکھنا اور کسی کو پہچانے بغیر دروازہ نہیں کھولنا۔تمہارے تایا اور ان کا بیٹا اگر دروازہ بجائیں تو ہرگز نہیں کھولنا تمہارے پاپا کا موبائل ہے نا تمہارے پاس؟''

''جی۔''اس نے سر ہلایا۔

''ایسی ویسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً فون کر دینا میں نے رشید اور اس کی بیوی کو بھی سمجھا دیا ہے وہ تمہارا خیال رکھیں گے اور گڑیا تمہارے یہ رشتے دار اگر تم سے کسی قسم کے پیپرز پر سائن کرنے کو کہیں تو تم ہرگز سائن نہیں کرو گی اوکے''۔انہوں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''اوکے''۔

''چلو اب تم آرام کرو میں انشاء اللہ امی ابو کے ساتھ آؤں گا''۔یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑے تو اجالا نے بے اختیار انہیں پکارا۔

''انکل شانی''۔اس کے لہجے میں جو نمی اور تڑپ تھی اس نے ذیشان کو پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے دیکھا اس کی حسین شربتی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ چاند چہرہ اداسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی معصومیت اور یہ افسردگی ذیشان کے دل میں ہلچل مچا گئی۔ ان کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ یہ ہنستی بولتی گڑیا کیسی غمزدہ لگ رہی تھی۔ دکھوں کے کیسے پہاڑ اس معصوم پر ٹوٹے تھے کہ وہ خود بھی ٹوٹ گئی تھی۔ بکھر گئی تھی اور وہ ہی تو تھے اسے سنبھالنے اور سمجھنے والے۔

''گڑیا اجالا بانی رو تے نہیں تم تو بہت بہادر بچی ہو سب ٹھیک ہو جائے گا چندا
نا نہیں ہے تم تو میری سویٹ بے بی، ہوں شاباش میں صبح پھر آ وں گا۔'' انہوں
نے اس کے رخسار پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر بہت محبت سے کہا۔
''صبح میں تو بہت دیر ہے انکل شانی''۔ وہ جھجکتی آواز میں بولی۔
''ارے پگلی تم تو خود اجالا ہو اجالا ہو کر رات کی طوالت اور تاریکی سے ڈر
ی ہو۔ نہیں میری گڑیا ڈرتے نہیں ہیں ڈرنے سے تو اندھیرا اور بھی بڑھ جائے گا،
ادری اور ہمت سے کام لو انشاء اللہ یہ پریشان کن وقت جلد گزر جائے گا اب میں
اؤں سویٹ ہارٹ''۔ انہوں نے بہت پیار سے کہتے ہوئے آخر میں جانے کا
چھا۔
''جی تھینک یو انکل شانی اللہ حافظ''۔ اس نے پرنم آواز میں کہا۔
''اللہ حافظ اینڈ ٹیک کیئر''۔ ذیشان نے اس کا گال تھپتھپایا اور وہاں سے چلے
گئے اور اجالا نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر لیا۔ رات کو وہ سونے کے لیے لیٹی
تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ باہر سے افراسیاب اور طاہرہ کی آوازیں
سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آیت الکرسی اور درود پاک پڑھتی رہی۔
ادھر ذیشان کو بھی ایک پل کے لیے چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بستر پر سونے کے
لیے لیٹے مگر نیند کی جگہ ان کی آنکھوں میں اجالا کی معصوم حسین صورت اور آنسوؤں
بھری آنکھیں ثبت ہو گئیں تھیں۔ وہ جو حالت آتے سے اس کی دیکھ کر آئے تھے وہ
ہی ان کی آنکھوں میں نقش ہو گئی تھی کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تو اٹھ بیٹھے۔
''یا اللہ میں کیا کروں اجالا کے لیے۔ مجھ سے اس کا غم اس کے آنسو سہے نہیں
جاتے''۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بے بسی سے بولے اور پھر وال کلاک پر
نگاہ ڈالی رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔
لاؤنج کی لائٹ جلتی دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ امی تہجد کی نماز ادا کر رہی ہوں گی وہ وہیں
آ گئے۔ صفیہ بیگم نماز ادا کر چکی تھیں تسبیح کر رہی تھیں۔ ذیشان وہیں کرسی پر بیٹھ گئے۔
صفیہ بیگم نے تسبیح سے فارغ ہو کر ان کے چہرے کو دیکھا وہ انہیں بہت پریشان دکھائی

دے رہے تھے۔
''شانی کیا بات ہے بیٹا ابھی تک جاگ رہے ہو؟'' صفیہ بیگم نے ان کے
بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے پوچھا تو وہ بے بسی سے گویا ہوئے۔
''امی اجالا کی آنسوؤں بھری آنکھیں مجھے سونے نہیں دے رہیں۔ اس کی
دکھ اور پریشانی پر میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو بھی چین نہیں آ رہا مجھے میرا دل
چاہ رہا ہے کہ میں ابھی اس کے پاس جاؤں اور اسے یہاں لے آؤں''۔
''لے آنا لیکن ابھی نہیں صبح میں اور تمہارے ابو بھی تمہارے ساتھ چلیں
گے''۔ صفیہ نے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسی نرمی اور محبت سے کہا۔
''مجھے یقین ہے امی وہ جاگ رہی ہوگی خوفزدہ ہوگی وہ خود غرض اور لالچی
لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں تم اپنا دل برا مت کرو ہم انشاء اللہ صبح اجالا کو اپنے گھر لے
آئیں گے۔ ابھی تم جاؤ اور جا کر اطمینان سے سو جاؤ کچھ نہیں ہوگا تمہاری گڑیا جس
کے اتنے چاہنے والے انکل ہوں اسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا''۔ صفیہ بیگم نے مسکراتے
ہوئے پیار سے کہا تو وہ ان کے ہاتھ چوم کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور وضو کر کے
جائے نماز بچھائی اور اللہ سے مدد اور اس مسئلے کا حل طلب کرنے لگے۔

صبح نو بجے وہ صفیہ بیگم کے ساتھ شہاب ولا روانہ ہوئے۔ فیضان صاحب کو
چند ضروری کام نمٹانے تھے وہ گھنٹے بھر میں وہاں پہنچنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ ذیشان اور
صفیہ بیگم کی گاڑی شہاب ولا کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو رشید انہیں دیکھ کر بھاگا
چلا آیا۔
''السلام علیکم صاحب۔'' رشید نے انہیں دیکھتے ہی قریب آ کر سلام کیا۔
''وعلیکم السلام رشید سناؤ کیا خبریں ہیں''۔
ذیشان نے گاڑی سے نکلتے ہوئے پوچھا۔
''صاحب آپ اچھے وقت پر آئے ہیں وہ سب لوگ آپ کے جانے کے بعد
اجالا بٹیا سے ناصر صاحب کا نکاح پڑھوانا چاہ رہے تھے''۔

''واٹ ... پھر؟'' ذیشان بری طرح چونک کر بولے صفیہ بیگم نے بھی پریشانی سے انہیں دیکھا۔

''وہ تو جی اجالا بیٹی نے اپنے کمرے کا دروازہ ہی نہیں کھولا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ پرسوں اتوار کی چھٹی ہے چھٹی والے دن وہ جس کاغذ پر کہیں گے وہ دستخط کر دیں گی ابھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انہیں آرام کرنے دیں۔'' رشید نے جلدی سے بتایا وہ اندر کی جانب تیزی سے بڑھ رہے تھے پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ ان کی آنکھیں رات بھر جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ سر الگ بھاری بھاری تھا۔

''اجالا کہاں ہے؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ جی اپنے کمرے میں ہیں ابھی سوئی ہیں ساری رات پریشانی میں جاگتی رہی ہیں۔ ذیشان صاحب بیگم صاحبہ آپ کچھ کریں ہماری بٹیا کے لیے ہم ان کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتے جی۔'' شکیلہ بھی آ گئی تھی اور رندھی آواز میں بولیں۔

''تم دعا کرو ہم کرتے ہیں کچھ آج جمعہ ہے نا ذیشان''۔ صفیہ بیگم نے کہا۔

''جی امی''۔ وہ بولے۔

''مبارک دن ہے مناسب رہے گا رشید گاڑی میں کچھ چیزیں رکھی ہیں وہ اٹھا کر اندر لے آؤ اور فیضان صاحب آ جائیں تو انہیں بھی اندر لے آنا۔'' صفیہ بیگم نے اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔'' وہ گاڑی کی جانب چلا گیا۔

''کیسی چیزیں رکھی ہیں آپ نے امی؟''

''ہیں کچھ چیزیں تم آؤ میرے ساتھ اجالا بیٹی کو دیکھیں''۔ وہ جالا کے کمرے کے قریب آ کر رک گئیں۔

''بیگم صاحبہ جی یہ چابی اجالا بی بی کے کمرے کی ہے آپ لاک کھول کر اندر چلی جائیں''۔ شکیلہ نے اپنے دوپٹے کے کونے سے بندھی چابی کھول کر انہیں دیتے ہوئے کہا۔ انہوں نے چابی لے کر لاک کھولا اور دروازہ پیچھے دھکیل کر اندر داخل

ہوگئیں۔ ذیشان بھی ان کے پیچھے ہی چلے آئے۔ اجالا اپنے بیڈ پر بے سدھ سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔

''میری بچی کیا حالت بنا دی ہے ان لوگوں نے''۔ صفیہ بیگم نے اجالا کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دے کر دکھی لہجے میں بولیں۔ اجالا نے کسمسا کر سر کو ذرا سا ہلایا۔ صفیہ بیگم وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ذیشان بہت محبت اور دکھ سے اجالا کے چہرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایسا کیا کریں جو ان کی اجالا کو اس مشکل اور مصیبت سے نجات دلا دے۔

''شان بیٹا کیا سوچ رہے ہو؟'' صفیہ بیگم نے پوچھا۔

''یہی کہ میں کیا کروں اجالا کے لیے''۔ وہ ان کے برابر میں صوفے پر بیٹھے ہوئے بے بسی سے بولے تو اجالا کے حواس بیدار ہو گئے ان کی آمد کا احساس تو اسے اسی وقت ہو گیا تھا جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے مگر آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں تھی اس میں سو چپکی لیٹی رہی۔

''بہت عزیز ہے نا اجالا تمہیں''۔ صفیہ بیگم نے نرمی سے کہا۔

''اپنی جان سے بھی زیادہ''۔ وہ اجالا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے تو اجالا کے دل میں ان کے لیے ڈھیروں پیار امڈ آیا۔

''تو تم یقیناً یہ تو نہیں چاہو گے کہ تمہاری جان سے عزیز ترین ہستی کو مطلبی اور لالچی لوگ لے جائیں اور اس کی زندگی تباہ کر لیں۔'' صفیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

''یقیناً میں ایسا نہیں چاہوں گا امی جو شخص پودا اپنے ہاتھوں سے لگائے اسے پروان چڑھائے کیا وہ ایسا سوچ سکتا ہے کہ اس پھول دار پودے کی خوشبو کوئی غیر چرا کر لے جائے نہیں امی ایسا کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں اجالا کو کسی قیمت پر ان لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا''۔ وہ سنجیدگی سے بولے۔

''تو یقیناً اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ تم اجالا سے نکاح کر لو۔''

''واٹ......؟'' ذیشان کو جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا تھا وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ بجلی تو اجالا کے اعصاب پر بھی گری تھی مگر خاموش لیٹی رہی۔ وہ

دیکھنا چاہتی تھی کہ تقدیر اسے کس موڑ پر لے جاتی ہے دنیا اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

''شان اسی میں اجالا کی عافیت ہے۔''

''امی فار گاڈ سیک ایسا کیسے ممکن ہے آپ جانتی ہیں کہ میں اجالا کو اس کی پیدائش کے دن سے لے کر آج تک اپنی......؟''

''جانتی ہوں بیٹا۔'' صفیہ بیگم نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اجالا کو تم سے بہتر کوئی جانتا نہیں تم سے بڑھ کر کوئی چاہتا ہے نہ تم اجالا کے بغیر رہ سکتے ہو اور شاید اجالا بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تو کیا ہی اچھا ہو کہ تم دونوں ایک مضبوط شرعی رشتے میں بندھ جاؤ اس طرح تمہیں اجالا کے لیے پریشان بھی نہیں ہونا پڑے گا کہ وہ ہر وقت تمہارے ساتھ تمہارے پاس رہے گی اور اسے بھی اپنے مطلبی، خود غرض اور لالچی رشتے داروں سے نجات بھی مل جائے گی۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے امی مگر ہم اجالا کو ویسے بھی تو اپنے گھر لے جا سکتے ہیں اس کے گارڈین تو ہم ہی ہیں پتا نہیں کیا سوچ کر شہاب نے اپنی وصیت لکھوا رکھی تھی۔'' وہ الجھن اور پریشانی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے بولے۔

''بیٹا یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں ہم تم اس میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتے تمہارا ساتھ اجالا کے ساتھ ہی لکھا ہوگا اس لیے انکار مت......''

''امی میں اقرار بھی کیسے کرلوں؟'' وہ سر پکڑ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔

''پھر کیا چاہتے ہو تم اجالا کے رشتے داروں کا حال تو تم دیکھ ہی چکے ہو وہ تو اس پھول سی بچی کو مسل کے رکھ دیں گے۔'' صفیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ تڑپ کر بولے۔

''اللہ نہ کرے امی اس گڑیا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے ورنہ میں کیسے زندہ رہوں گا''۔

''جبھی تو کہہ رہی ہوں بیٹا جس کے بغیر جی نہیں سکتے اسے دوسروں کے حوالے کر کے جی سکو گے کیا؟ جب سگے رشتے دار محض دولت کی وجہ سے اس معصوم کو اپنانا چاہتے ہیں تو تم خود سوچو۔ دنیا بڑی خراب ہے بیٹا اکیلی معصوم اور کم سن لڑکی کے جینے کے در بند کر دیتی ہے۔'' یہ صفیہ بیگم انہیں سنجیدگی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی لیکن اجالا سنے گی تو کیا سوچے گی یہ ابھی بچی ہے''۔

''اس کا بچپنا تو شہاب اور غزالہ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب اسے بچانا تمہارا فرض ہے ہم اسے یونہی اپنے گھر لے تو جائیں بیٹا مگر اس کے ننھیال اور ددھیال سے کون جھگڑا مول لے گا۔ وہ تو عدالت بھی جا سکتے ہیں۔ وہ اس کے اپنے ہیں فیصلہ ان کے حق میں بھی ہو سکتا ہے اور نہ ہو تب بھی کورٹ کچہری کے چکر میں پڑ کر اجالا بیٹی کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگا لوگ الگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اس کے رشتے دار ہم سے اسے اپنے گھر میں رکھنے کا سبب پوچھیں گے تو ہم انہیں بتا تو سکیں گے ناں کہ یہ ہمارے گھر میں تمہاری بیوی ہماری بہو بیٹی بن کر آئی ہے سمجھ رہے ہو میری بات۔ اور سنو بے شک اجالا کی تمام جائیداد اس کے رشتے داروں کو دے دو لیکن اس کے بدلے اجالا بیٹی لے لو مجھے اپنی بیٹی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے''۔

''جی امی لیکن''۔

''بس اب کوئی لیکن ویکن نہیں چلے گی''۔ صفیہ بیگم نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''محبت اور مجبوری میں کوئی دلیل کام نہیں آتی۔ تم اللہ کا نام لے کر نکاح کی تیاری کرو۔''

''اور ابو۔''

''تمہارے ابو سے تو میر   رات ہی بات کر لی تھی، وہ بھی میرے اس فیصلے

سے متفق ہیں اور تمام انتظامات کر کے ہی یہاں پہنچیں گے۔ نکاح سادگی سے ہوگا البتہ ولیمہ ہم خوب اہتمام سے کریں گے۔ شہلا آ جائے گی تو ساری رسمیں بھی ادا ہوں گی مہندی ضرور لگے گی میری اجالا کے ہاتھوں میں''۔

صفیہ بیگم تو ہر بات کا جواب پہلے سے سوچے بیٹھے تھیں۔ تفصیل سے بات مکمل کرنے کے بعد مسکرا کر انہیں دیکھا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ امی کی تلخ باتیں ان کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں وہ کسی بھی قیمت پر اجالا کے لبوں کی ہنسی واپس لانا چاہتے تھے چاہے اس کے لیے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔

''شان انکل میں آپ کی زندگی میں آپ کی مرضی کے بغیر داخل ہو کر آپ کے لیے پریشانی کا باعث تو نہیں بننا چاہتی پلیز آپ انکار کر دیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اجالا نے دل میں انہیں مخاطب کر کے کہا اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے آنسو چپکے سے بہہ نکلے۔ ذیشان کمرے سے جا چکے تھے۔

چند منٹ بعد وہ صفیہ بیگم کے ہاتھ اپنے بالوں میں محسوس کر کے اٹھ بیٹھی۔ انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور اپنے فیصلے سے بھی وہ کچھ نہ بول سکی۔ چپ چاپ اپنے اور ذیشان کے درمیان موجود رشتے اور تعلق کو رنگ بدلتے دیکھتی رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد فیضان صاحب اپنے دو دوستوں کے ساتھ وہاں آ گئے۔ قاضی صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے گھر کے تینوں ملازم تھے اور سادگی سے قبول و ایجاب کی رسم ادا کی گئی۔

ذیشان بے حد الجھے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قسمت نے یہ کیسا موڑ بدلا ہے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اجالا کو بیوی کی حیثیت سے تین بار قبول کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اجالا کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ اسے مما پاپا یاد آ رہے تھے۔ اسے ذیشان کے اور اپنے تعلق کا یہ انوکھا روپ پریشان کر رہا تھا۔ اب ذیشان کی زندگی میں ان کی مرضی کے بغیر اس مضبوط بندھن کے حوالے سے داخل ہونا خود اپنی ہی نظروں سے شرمسار کر لیا تھا۔

وہ ذیشان سے محبت کرتی تھی بے حد و بے حساب اور ذیشان بھی اسے بے پناہ چاہتے تھے لیکن ان کی محبت اس طرح بھی رنگ بدل سکتی ہے ان دونوں میں سے کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حیرت زدہ اور خاموش تھے۔ شہاب ولا کے ملازموں کو کچھ دن کی چھٹی دے دی گئی اور شہاب ولا کو صفیہ بیگم نے تالے لگا دیئے اور اجالا کا سارا ضروری سامان پیک کرا کر اسے اپنے ساتھ اپنے گھر فیضان ولا لے آئیں۔

اجالا کے تو آنسو بہنا ہی بند نہیں ہو رہے۔ ذیشان سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر گھر سے باہر نکل گئے۔ صفیہ بیگم نے اجالا کو بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ اسے کھانا اور سر درد کی دوا کھلا کر الگ کمرے میں سلا دیا۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اس لیے دیر تلک سوئی رہی۔

رات کے کھانے پر ذیشان موجود نہیں تھے۔ اجالا بھی اپنے کمرے میں ہی رہی۔ اگلا دن بھی اس نے کمرے میں بند رو رو کر اور سو کر گزارہ۔ اتوار کے روز ان کا ولیمہ تھا۔ بیگم فیضان چاہتی تھیں کہ اس سے پہلے کہ اجالا کے سلسلے میں کوئی سوال اٹھے اس کا ذیشان کے ساتھ رشتہ اوپن ہو جانا چاہیے۔

ذیشان انتظامات میں مصروف تھے اجالا کو انہوں نے ولیمے کی شام دلہن کے روپ میں دیکھا تو دھنگ رہ گئے۔ وہ میرون عروسی جوڑے میں زیورات اور میک اپ میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اتنا حسن، اتنا روپ اور نکھار آیا تھا اس پر دلہن بن کر کہ بھی تعریف کر رہے تھے اور ذیشان کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ خود ذیشان کے دل کی حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ حیران تھے کہ محبت رنگ بدلتی ہے تو ساتھ ہی دل کی کیفیات بھی بدل دیتی۔

اجالا ان کی محبت تھی اولین محبت مگر محبت کا یہ رنگ قبول کرنا اور اس کا پرانی محبت کی طرح بے ساختہ و برملا اظہار کرنا فی الحال ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔ سو وہ ان کے سندر سراپے سے نظریں چرا گئے۔

رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ جب ذیشان اپنے بیڈروم میں داخل ہوئے اجالا کو صوفے کے کونے میں گم صم بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ وہ اپنا عروسی لباس تبدیل کر چکی تھی اور اس وقت ہلکے سرمئی رنگ کا کاٹن کا شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھے اور کہیں سے بھی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔ جیولری اور میک اپ سے مبرا چہرہ اور بھی حسین لگ رہا تھا۔ ذیشان نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ روتی رہی ہے۔

''اجالا تم ابھی تک جاگ رہی ہو سو جاؤ گڑیا''۔ انہوں نے اس کے قریب آتے ہوئے اسی نرم لہجے میں کہا جو ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔

''کہاں سوؤں؟'' اجالا نے اپنی گھنی پلکوں کی جھالر اٹھا کر انہیں دیکھا تو ذیشان کا دل تڑپ اٹھا۔ شربتی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ جام چھلکنے کو بے تاب تھے جیسے۔ انہیں اس پر بے حد پیار آیا۔ مگر اظہار کی پرانی روش ساتھ نہ لایا وہ ضبط کر گئے۔

''یہاں سو جاؤ اٹھو شاباش یہ بیڈروم اب تمہارا بھی ہے''۔ انہوں نے پیار سے کہا۔

''اور آپ؟'' اجالا نے دل میں ان سے کہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا اور وہ خاموشی سے صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ آنسو خود بخود پلکوں کی باڑ توڑ کر بہنے لگے۔ ذیشان نے بہت بے بسی اور کرب سے اسے دیکھا ان کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لیں دل میں چھپا لیں۔

''کیوں رو رہی ہو گڑیا؟'' میں ہوں نا تمہارے پاس تمہارے ساتھ ڈرو نہیں آرام سے سو جاؤ انشاء اللہ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیٹ جاؤ شاباش''۔ ذیشان نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بہت پیار سے کہا اور اس کے لیٹنے پر چادر اس پر پھیلا دی۔ بہت دیر بعد اس کی آنکھ لگی تھی اور ذیشان اتنی دیر پریشانی سے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ اس کے سونے پر خود بھی بیڈ پر اس سے کافی فاصلے پر لیٹ گئے۔ کافی تھکے ہوئے تھے وہ لیٹتے ہی انہیں بھی نیند آ گئی۔

صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو اجالا کے بے حد قریب پایا وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حسن و دلکشی کی معصومیت سجی ہوئی تھی۔ ذیشان کا دل چاہا کہ اسے جھک کر پیار کریں۔ پہلے وہ اسے بلا جھجک پیار کر لیا کرتے تھے اب وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی روشن پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت نہ کر سکے عجیب سی جھجک آڑے آ رہی تھی حالانکہ انہیں اس پر پورا حق اور اختیار تھا۔ بہت مضبوط رشتہ تھا یہ پھر بھی وہ دل کے کہے پر عمل نہ کر سکے اور خود پہ ضبط اور جبر کرتے ہوئے ہال سے اٹھ گئے اور اجالا کے جاگنے سے پہلے ہی تیار ہوئے اور ناشتہ کر کے فیکٹری چلے گئے۔ اجالا نے صفیہ بیگم کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ذیشان کو یوں چلے جانا اسے دکھ ہو رہا تھا۔ ان کی محبت یکا یک بے رخی میں بدل رہی تھی جو اس کے لیے سوہان روح تھی۔

''کیا ذیشان کی محبت کا رنگ بھی پختہ نہیں تھا۔ میری زندگی میں ان کی محبت کی کوئی سحر نوید سحر بن کر نہیں ابھرے گی۔ میری زندگی کے بے اماں قافلے کو لوگوں کے منفی رویوں کی چلچلاتی دھوپ سے مجھے بچا کر سایہ دینے والے امان دینے والے ذیشان کیا دل سے مجھے قبول کر سکیں گے کبھی؟'' اس نے پریشان ہو کر سوچا تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔

''ہیلو گڑیا۔'' شام کو ذیشان گھر آئے تو اسے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے پایا وہیں آ کر اسے مخاطب کیا وہ گھبرا گئی اور فوراً سلام کیا۔

''السلام علیکم''۔

''وعلیکم السلام امی کہاں ہیں؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''مغرب کی نماز ادا کر رہی ہیں''۔ اس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے بتایا۔

''تم نے پڑھ لی نماز؟'' وہ اس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''جی۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''اور سارا دن کیا کیا؟''

''آپ کا انتظار''۔ اس نے اپنے دل میں کہا مگر لب خاموش رہے۔

''اجالا گڑیا کیا سوچنے لگیں؟'' انہوں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ملامت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں چائے لاؤں آپ کے لیے؟'' وہ کھڑی ہو کر بولی۔

''ہوں..... نہیں موڈ نہیں ہے میں ذرا چینج کر لوں''۔ وہ بھی یہ کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلے گئے۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ ذیشان صبح سویرے ناشتے کے بعد تیار ہو کر فیکٹری چلے جاتے اور شام کو اکثر دیر سے گھر آتے۔ اجالا سے سلام دعا تک کا سلسلہ تھا ان کا۔ رات کو اپنے کمرے میں بھی اس وقت جاتے جب انہیں یقین ہو جاتا کہ اجالا اب تک سو چکی ہو گی۔

وہ نہ صرف اسے نظر انداز کر رہے تھے بلکہ اس سے کترا بھی رہے تھے۔ وہ کم سے کم اس کا سامنا کرتے۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ اس کے لیے آئس کریم لائے تھے نہ چاکلیٹ نہ انہوں نے اس کے ساتھ کوئی گیم کھیلی تھی اور نہ ہی اس کو کہیں باہر گھمانے لے گئے تھے۔ اس سے مکمل گریز برت رہے تھے۔ اجالا اندر ہی اندر ان کی اس بے رخی اور لاتعلقی پر روتی رہتی تھی۔ اتنے مضبوط رشتے اور تعلق سے اتنی بے گانگی اور اجنبیت برت رہے تھے وہ کہ ایک گھر میں ایک کمرے میں ایک بیڈ پر سوتے ہوئے بھی وہ اس سے لاتعلق رہتے۔ ان کی یہ لاتعلقی اسے مار رہی تھی۔

ان کی محبتوں کے خزانے سمیٹنے والی اجالا اب ان کی ایک نگاہ الفت کو ایک پیار بھرے جملے کو ترس رہی تھی۔ وہ کم عمر ضرور تھی مگر حالات و واقعات نے اسے زندگی کے حقائق سے اچھی طرح روشناس کرا دیا تھا۔ وہ قرآن اور دیگر کتب پڑھتی رہتی تھی اسے اپنے اور ذیشان کے رشتے کی نوعیت اور تعلق کے تقاضوں کا بخوبی علم تھا۔ لاعلم رہتی تو شاید اتنی دکھی اور پریشان نہ ہوتی۔

ذیشان کو وہ میرون رنگ میں بہت اچھی لگتی تھی۔ اجالا نے اس شام میرون رنگ کا بہت ہی خوبصورت لباس پہنا۔ ہلکا سا میک اپ کیا جیولری پہنی پرفیوم چھڑکا

بہت دنوں بعد اس نے خود کو سنوارا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید ذیشان کی نگاہ الفت اس پر پڑ جائے۔

شام کو ذیشان گھر آئے تو اسے چند لمحوں کو تو دیکھتے رہ گئے بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی چاہے جانے کی لائق تھی۔ جانے کیا سوچ کر وہ آگے بڑھے اجالا نے اس کو اپنی خوش بختی سمجھا مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر میز کی طرف جھک کر پانی کا گلاس اٹھانے لگے۔ اجالا کا دل ٹوٹ گیا تھا وہ جو اسے حوروں جیسی کہتے تھے اب ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ کہا تو یہ کہا بلکہ پوچھا۔

''تم کہیں جا رہی ہو کیا؟''

''نہیں تو''۔ وہ بمشکل بول پائی۔

''تمہاری تیاری دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ کہیں جا رہی ہو۔'' انہوں نے کہا تو وہ بمشکل اپنی ڈوبتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

''امی کہتی ہیں کہ تیار رہا کرو تم نئی دلہن ہو اس لیے''۔

''میں چینج کر لوں''۔ وہ اس کو دیکھتے اس کے روپ کو نگاہوں میں بساتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''چینج تو مجھے کر لینا چاہیے کیا فائدہ اس تیاری کا؟'' وہ بھیگی آنکھوں سے ان کے بیڈ روم کے دروازے کو دیکھتی ہوئی خود سے بولی۔

''اجالا بیٹی ذیشان آ گیا کیا؟'' صفیہ بیگم نماز پڑھ کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔

''جی امی چینج کرنے گئے ہیں''۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا صفیہ بیگم چونک گئیں اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا ہوا اجالا بیٹی؟'' انہوں نے بہت محبت سے پوچھا۔

''امی کیا اب میں بری لگنے لگی ہوں؟'' اس نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

''اب کیا مطلب چندا تم تو پہلے بھی بری نہ تھیں بہت حسین تھیں اور اب تو بہت ہی حسین اور خوبصورت ہو گئی ہو۔ میں تو تمہاری نظر اتارتی رہتی ہوں ہر وقت تم نے

یہ کیا سوال کر دیا؟"

"کیا بات ہے ذیشان نے کچھ کہا ہے کیا؟"

"وہ تو کچھ کہتے ہی نہیں ہیں۔" اجالا نے بھیگتی آواز میں کہا تو انہوں نے حیرت اور دکھ سے اسے دیکھا وہ ساری بات سمجھ گئیں تھیں۔ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور محبت سے بولیں۔

"میں بات کروں گی ذیشان سے"۔

"نہیں امی آپ ان سے کوئی بات نہیں کریں گی مجھے زبردستی کی توجہ اور محبت نہیں چاہیے یہ اچھا نہیں ہوا امی اس رشتے نے تو مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میرے دوست میرے انکل میرے ہمراز چھین لیے ہیں مجھ سے میں بالکل اکیلی ہوگئی ہوں میرا کوئی دوست بھی نہیں رہا۔" اس نے روتے ہوئے کہا تو صفیہ بیگم حیران پریشان رہ گئیں اور وہ روتی ہوئی لان میں چلی گئی۔

"السلام علیکم امی"۔ ذیشان کپڑے بدل کر آئے تو انہیں بیٹھا دیکھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بہت دیر سے آنے لگے ہو آج کل۔" صفیہ بیگم نے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس امی کام کچھ بڑھ گیا ہے"۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کام واقعی بڑھ گیا ہے یا تم نے بڑھا لیا ہے"۔

"میں سمجھا نہیں امی۔"

"تم اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو میں نوٹ کر رہی ہوں شانی کہ تم نے شادی کے بعد سے فیکٹری اور آفس میں اپنی مصروفیات بڑھا لی ہیں اور گھر کو خاص کر اجالا کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں اس کے ساتھ پہلے سے زیادہ وقت گزارنا چاہیے تم تو اسے اب اتنا وقت بھی نہیں دیتے کہ جتنا شادی سے پہلے دیا کرتے تھے نہ اسے کہیں سیر کرانے لے گئے کیوں آخر کیا اجالا کے لیے تمہارے دل سے محبت ختم ہوگئی ہے؟" صفیہ بیگم نے نہایت سنجیدگی سے ان کی کلاس لے ڈالی وہ گھبرا گئے۔

"یہ بات نہیں ہے امی"۔ وہ بے چین ہو کر بولے۔

"تو پھر کیا بات ہے تم کیوں اس معصوم بچی کو رلا رہے ہو اس سے تو اچھا تھا کہ تم شادی کے لیے ہاں ہی نہ کرتے اسے اس کے تایا یا ماموں کے بیٹے سے بیاہ دیتے انہوں نے بھی تو اس کے ساتھ یہی سلوک کرنا تھا اجالا سے تو لاتعلقی ہی برتنی تھی جیسے تم برت رہے ہو"۔

"امی پلیز مجھے ان لوگوں سے تو کمپیئر مت کریں۔" وہ تڑپ کر بولے۔

"تو کیا کروں میرے چاند مجھے تو اس بچی سے شرمندگی محسوس ہوتی ہے میں نے ہی یہ رشتہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر تم مجھے اجالا کے سامنے شرمندہ کرانے پر تلے ہو۔ وہ بہت حساس ہے ماں باپ کی موت کا صدمہ کیا کم ہے اس کے لیے جو تم اسے اپنی بے رخی اور عدم توجہ کا صدمہ بھی دیئے چلے جا رہے ہو۔ میں نے کہہ دیا ہے شان اب اگر تم نے اجالا سے بے اعتنائی برتی تو پھر مجھ سے بھی بات مت کرنا۔" صفیہ بیگم نے دوٹوک لہجے میں کہا تو وہ حیران ہو کر بولے۔

"امی بہو کے لیے اتنی محبت"۔

"بہو نہیں ہمیشہ بیٹی سمجھا ہے میں نے اسے اور کوئی ماں اپنی بیٹی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"اور بیٹے کو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اجالا ہے کہاں؟" وہ کھڑے ہو کر بولے۔

"باہر لان میں ہوگی"۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر باہر لان کی طرف آئے تو اجالا کو لان کی گھاس سے کانٹے دار پودے نکالتے دیکھا جو مالی کی غفلت کے باعث اگ گئے تھے۔

"کیا کر رہی ہو گڑیا؟" وہ اس کے سامنے گھاس پر بیٹھ کر پوچھ رہے تھے۔

"کانٹے نکال رہی ہوں مالی کی غفلت اور لاپرواہی سے جگہ جگہ نکل آئے ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ چونک گئے اتنی گہری بات کی توقع نہیں تھی

انہیں اس لیے پھر سنبھل کر بولے۔

''رہنے دو تمہارے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے۔''

''کیا فرق پڑے گا اگر ہاتھ بھی زخمی ہو گئے تو؟'' اس نے بھی زور دے کر کہا تھا۔ ذیشان کی حیرت اور پریشانی بڑھ رہی تھی یہ اجالا ہی بول رہی تھی یا کوئی اور تھا انہیں اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اتنی سنجیدہ اور رنجیدہ تھی وہ۔

''اچھا چلو میں تمہیں آئس کریم کھلانے لے چلوں۔''

''میرا موڈ نہیں ہے۔'' وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''چاکلیٹ کھاؤ گی۔''

''نہیں میرے دانت خراب ہو جائیں گے''۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے بہلانا چاہ رہے ہیں۔

''پہلے تو خراب نہیں ہوئے تھے۔'' وہ بدستور حیران پریشان اسے تک رہے تھے۔

''پہلے تو کچھ بھی خراب نہیں ہوتا۔'' پر معنی خیز جملہ اور لہجہ اجالا کو یقین تھا کہ امی نے اس سے بات کی ہے جبھی وہ اس سے اتنی بات کر رہے ہیں اسے بہلانے کے لیے جیسے وہ بچی ہی تو ہے اب بھی جو آئس کریم اور چاکلیٹ سے بہل جائے گی۔ مگر وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ وہ ایک دم سے کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کے اندر جھانک کر دیکھنے یا اس کی سوچوں کو پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

''جوائے لینڈ چلو گی؟'' ذیشان نے اس کی فیورٹ جگہوں کے نام لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اب میں بہت بڑی ہوئی ہوں آپ ان جگہوں پہ جانے کے لیے آپ سے کبھی ضد نہیں کروں گی۔'' اس نے نہایت سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور انہیں حیران چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

وہ اس سے ایک قدم دور ہوتے تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اب اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ ان پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرے گی جو رشتہ اور تعلق دل سے

قبول ہی نہ کیا جائے اسے مجبوراً نبھایا نہیں جا سکتا۔ ذیشان کی اپنی کوئی پسند ہو گی اور وہ کم عمر لڑکی سے جو کہ ان کی دوست اور بیٹی جیسی تھی کہ ساتھ کیسے شادی کا تعلق جوڑ لیتے۔ یہ اجالا کا خیال تھا اور اس نے خود کو سمجھا لیا تھا۔

رات کو جب ذیشان بیڈ روم میں آئے تو اجالا کو بیڈ کی بجائے صوفے پر سوتے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے مگر اسے جگانے کی ہمت نہ کر سکے۔ خود بیڈ پر لیٹ کر بے چین و بے سکون رہے۔

''تم رات صوفے پر کیوں سو گئیں؟'' صبح انہوں نے اٹھتے ہی پہلا سوال کیا۔

''کیونکہ پہلے مجھے اپنی جگہ کا علم نہیں تھا۔'' اجالا نے سنجیدگی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اف میں کیا کروں گڑیا کو اچانک کیا ہو گیا ہے؟'' وہ سر پکڑ کر بولے۔

''گڑیا کو کچھ نہیں ہوا تمہیں کچھ ہو گیا ہے تم نے اس سے جو لاتعلقی قائم کر رکھی اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کیا احسان کیا ہے تم نے اس پر اس سے شادی کر کے اتنا پیار کرتے تھے تم اسے اور اب اتنا ہی انتظار کرا رہے ہو تم اسے۔ اسے دکھی کر رہے ہو تم۔'' ان کے اندر سے آواز آئی تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔

اجالا نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔ صبح ذیشان کے آفس جانے کے بعد وہ صفیہ بیگم کے ساتھ مل کر کوکنگ سیکھتی۔ ملازمہ سے صفائی کراتی۔ اسٹڈی میں جا کر کتابیں پڑھتی۔ شام کو ذیشان آ جاتے تو سب کے لیے خود چائے بنا کر لاتی اور چائے پیتے ہی فیضان صاحب کے ساتھ گالف کھیلتے یا کسی کتاب پر تبصرہ کرنے لگتی۔ ذیشان سے ضرورتاً ہی بات ہوتی تھی۔ البتہ ان کے کپڑوں، جوتوں کا خیال وہ خود ہی رکھنے لگی تھی۔ روزانہ ان کے کپڑے پریس کروا کر وارڈ روب میں لٹکا دیتی جوتے پالش کر کے شوز ریک میں رکھتی۔ رات کو نماز کے بعد کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے صوفے پر سو جاتی۔ نہ ذیشان سے کوئی فالتو بات کرتی نہ شکوہ نہ گلہ نہ ان کے رویے پر احتجاج بس اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔

صفیہ بیگم اور فیضان صاحب بھی ان دونوں کی خاموشی ایک دوسرے سے

تعلق کو توٹ کر رہے تھے اور ذیشان کو ڈھکے چھپے لفظوں سے ان کی ذمہ داری کا احساس دلا چکے تھے ان کی لاپرواہی پر انہیں ٹوک چکے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

ادھر اجالا کے دونوں تایا اور ماموں شہاب ولاک لگا دیکھ کر بیرسٹر فیضان کے آفس گئے تھے اور ذیشان کی فیکٹری جا کر بھی انہوں نے خوب ہنگامہ لیا تھا۔ ان پر اجالا کو حبس بے جا میں رکھنے کا مقدمہ کرنے کی دھمکی دی تھی لیکن ذیشان اور اجالا کا نکاح نامہ دیکھنے کے بعد ان کی دھمکی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر انہوں نے اجالا سے زبردستی نکاح نامے پر دستخط کرانے کا الزام لگایا تو فیضان صاحب نے انہیں ان کی حرکتوں کے متعلق ٹھیک ٹھاک انداز میں آئینہ دکھا دیا اور اجالا کا بیان بھی ان کے خلاف دلانے کا کہا تو وہ لوگ تھک ہار کر واپس چلے گئے۔

اجالا کو یہ ساری باتیں فیضان صاحب کی زبانی معلوم ہوئی تھیں اس نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ مطلبی اور لالچی رشتے داروں سے نجات مل گئی تھی۔

ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا ان کی شادی کو اور ان کے بیچ اول روز سے در آنے والی اجنبیت اور لاتعلقی بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گئی تھی۔ اداسی اور غم نے اجالا کے اندر ڈیرے ڈال لیے تھے۔ موسم بدل رہا تھا۔ فضا میں خنکی کے ساتھ ساتھ اداسی بھی پھیلی تھی۔ ہوا جیسے ٹھہر گی تھی۔ چند لمحوں بعد چاند بادل میں چھپ گیا اور ہلکی ہلکی بوندیں برسنے لگیں۔ بارش کی خوشبو اجالا کو ٹیرس پر کھینچ لائی۔ اس نے ٹیرس کی ریلنگ پر پھیلی چنبیلی کی بیل میں سے ایک پھول توڑ کر اس کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو اپنی سانسوں میں اتاری اور پھر برستی بوندوں میں بھیگتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ اس کی سوچوں کا محور ذیشان تھے۔

"ذیشان آپ کو کیا خبر کہ میرا دل بھی چنبیلی کے اس پھول کی طرح تھا بہت حساس اور نازک جو آپ کے رویے کی گرمی سے کملا گیا ہے۔ میں نے تو آپ کو اپنی وجہ سے کبھی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہا۔ میں فوراً آپ کی زندگی سے نکل جاتی۔ مجھے

خود بھی آپ پر مسلط ہونا تو نہیں چاہتی تھی۔ آپ کی یہ بے رخی، بے گانگی اور بے اعتنائی تو مجھے اندر ہی اندر مار رہی ہے۔ میں اپنی ہی نظر میں گر گئی ہوں۔ قسمت کے آگے مجبور ہوں ورنہ میں نے کب ایسا چاہا تھا۔ میں نے تو بس آپ کو چاہا تھا۔ محبت کا رنگ کوئی بھی ہو محبت تو محبت ہی رہتی ہے نا۔

مجھے تو آپ اس رشتے کے حوالے سے بھی بے پناہ محبت ہے۔ آپ کو کوئی اور لڑکی پسند ہوگی نا اور میں آپ کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہوں۔ میں چلی جاؤں گی ذیشان مگر آپ مجھ سے اس طرح بے رخی تو مت برتیں۔ میں تو اپنی نظروں میں خود کو آپ کی مجرم تصور کرتی ہوں ڈھیروں پیار دے کر اب اتنی لاتعلقی، مر جاؤں گی آپ کی خوشی کے لیے میں آپ کی زندگی سے بھی نکل جاؤں گی میں اتنی خود غرض تو نہیں ہوں آپ مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ کر تو دیکھیں۔"

وہ دل میں ذیشان سے مخاطب تھی کہ ان کے قدموں کی چاپ پر سر اٹھا کر دیکھا ان کی اچانک آنکھ کھلی تھی اور وہ اسے کمرے میں نہ پا کر پریشان ہو گئے تھے اور ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس تک آ گئے تھے۔

"تم یہاں ہو تم نے تو مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولے۔

"جانتی ہوں کہ میں نے آپ کو بہت پریشان کر کے رکھ دیا ہے اور میں اس پر شرمندہ بھی ہوں بس آپ تھوڑی سی پریشانی اور اٹھالیں انشاء اللہ جلد ہی آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔" وہ بہت معنی خیز اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"اجالا یہ تم کس قسم کی باتیں کہہ رہی ہو چلو یہاں سے"۔ وہ الجھ کر بولے سردی ان کے بدن میں سرایت کر گئی تھی اور وہ مزے سے بارش میں بھیگ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری سر مجھے تو یہاں سے چلے ہی جانا ہے۔" وہ اسی انداز میں بولی اس نے اچانک ہی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ فیضان ولا سے چلے جانے کا فیصلہ۔

"ٹھنڈ نہیں لگ رہی تمہیں بارش میں بھیگ رہی ہو بیمار پڑ جاؤ گی"۔ وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے سمجھنے کے بعد قدرے تیز آواز میں بولے۔

''آپ مطمئن رہیے آپ کو تیمارداری کی زحمت نہیں دوں گی آپ جا کر سو جائیے''۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر بوندوں کو ان پر روکتے ہوئے بے نیازی سے کہا وہ بے کل و بے چین ہو گئے۔

''اور تم؟'' وہ اس کے بھیگتے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''مجھے نیند آئے گی تو میں بھی آ جاؤں گی''۔

''کیا بیوقوفی ہے گڑیا چلو اندر۔'' ذیشان نے جھلا کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو اس نے فوراً اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور تیزی سے ٹیرس سے نیچے چلی گئی۔ ذیشان اس کی اس حرکت پر حیران رہ گئے۔ انہیں اس سے اس قدر بداخلاقی تو ہرگز توقع نہیں تھی۔ پہلے تو کبھی اس نے ان کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔

اس کی باتیں، اس کا لہجہ اس کا رویہ انہیں مزید پریشان کر رہا تھا۔ وہ اب بھی اسے اپنے دل کی تمام تر شدتوں سے چاہتے تھے۔ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے اس کی باتیں انہیں بے قرار و مضطرب کر رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد خود بھی بیڈ روم میں آ گئے۔ وہ گیلے کپڑے تبدیل کر کے صوفے پر تکیہ اور کمبل لیے لیٹی تھی۔

''اُجالا اٹھو یہاں سے بیڈ پر لیٹو صوفے پر کیسے نیند آ جاتی ہے تمہیں؟''

''نیند تو انسان کو سولی پر بھی آ جاتی ہے یہ تو پھر صوفہ ہے کافی آرام دہ ہے''۔ اس نے یہ کہہ کر کمبل گردن تک کھینچ لیا۔ صبح وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی جاگ گئے اور تیار ہو کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ وہ رات کے ڈھائی تین بجے تک جاگتی رہی تھی اس لیے انہیں اندازہ تھا کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی اسے جگانا مناسب نہیں ہے۔

''اجالا نہیں آئی ابھی تک اس نے کالج نہیں جانا کیا ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' ناشتے کی میز پر صفیہ بیگم نے اجالا کو نہ پا کر کہا تو ذیشان کالج کے نام پر چونکے۔

''کالج کیا کرنے جانا ہے اس نے؟'' ذیشان نے چائے کا کپ میز پر واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اجالا نے کامرس کالج میں ایڈمشن لے لیا ہے ہفتہ ہوا اس کی کلاسز شروع ہو چکی ہیں تم کس دنیا میں رہتے ہو صاحبزادے؟'' فیضان صاحب نے ان پر انکشاف کیا تھا۔ وہ تو سمجھے تھے کہ وہ آگے پڑھنا ہی نہیں چاہتی اسی لیے اس نے ان سے اپنے ایف۔ ایس۔ سی کے رزلٹ کا بھی ذکر نہیں کیا۔ اس نے پورے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔

ذیشان بے حد خوش ہوئے تھے اس کی کامیابی پر مگر انہوں نے نہ اسے وش کیا اور نہ ہی اجالا نے ان سے اپنے رزلٹ کے متعلق کچھ بتایا۔ اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اس کے بیچ کس قدر اجنبیت آ گئی ہے۔ وہ ایک دم سے افسردہ اور دکھی ہو گئے۔

''یہ تو اپنی ہی دنیا میں مگن ہیں میں دیکھتی ہوں اجالا آئی کیوں نہیں ابھی تک'' صفیہ بیگم یہ کہہ کر ان کے بیڈ روم میں چلی آئیں۔ بیڈ خالی دیکھا اور اجالا کو صوفے پر سوتے دیکھ کر انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ ساری بات سمجھ گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ذیشان کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' صفیہ بیگم نے خود کلامی کی اور آگے بڑھ کر انہوں نے اجالا کے رخسار کو چھوا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ تو بخار میں جل رہی ہے اس کی پیشانی اور ہاتھ چھو کر انہوں نے اپنے خدشے کی تصدیق کی اور پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکلیں اور ذیشان کو آواز دی۔

''جی امی۔'' وہ ناشتہ چھوڑ کر فوراً دوڑے چلے آئے۔

''امی کے بچے اندر آؤ''۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے میں لے آئیں اور صوفے پر سوئی اجالا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے اجالا صوفے پر کیوں سو رہی ہے اور کیا روز وہیں سوتی ہے؟''

''امی وہ اپنی مرضی سے وہاں''۔ وہ خجل ہو کر سر کھجاتے ہوئے بولے۔

''شاباش ہے بیٹے ساری زندگی جس لڑکی کو اپنی مرضی سے چلاتے رہے بیوی بنا کر اس کی حیثیت کا تعین نہ کر سکے۔ وہ تو بچی ہے تم نے کون سا بڑے ہونے کا ثبوت دے دیا۔ سب سے زیادہ تم نے اسے چاہا اور اب سب سے زیادہ تم ہی اسے

نظر انداز کر رہے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ وہ بھی کرے گی۔'' وہ غصے سے بولیں وہ شرمندگی سے کہنے لگے۔

''امی آہستہ بولیں یہ جاگ جائے گی۔''

''کچھ خبر بھی ہے تمہیں اجالا بخار میں جل رہی ہے۔''

''لو تو رات کے ڈھائی بجے تک بارش میں بھیگنے کا اثر تو ہونا ہی تھا۔'' وہ پریشان ہو کر بولے۔

''بہت خوب۔'' صفیہ بیگم کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

''وہ رات گئے تک سردی کی بارش میں بھیگتی رہی اور تم کہاں تھے؟''

''امی میں تو سو رہا تھا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ بارش میں ...... وہ تو اچانک میری آنکھ کھلی تو یہ کمرے میں نہیں تھی۔'' وہ شرمندہ سے اپنی صفائی پیش کر رہے تھے۔

''واہ بیٹا اتنے بے خبر تو تم کبھی نہ تھے سارے ریکارڈ توڑ دیئے تم نے تو دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں اتنے جوتے ماروں کے تمہاری عقل ٹھکانے آ جائے۔'' صفیہ بیگم بہت غصے میں تھیں اجالا انہیں شہلا کی طرح عزیز تھی اس کی پریشانی اور تکلیف پر وہ سگی ماں کی طرح پریشان ہو رہی تھیں۔

''امی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''سمجھنے سمجھانے کی ضرورت مجھے نہیں تمہیں ہے۔'' وہ اجالا کے پاس بیٹھے ہوئے بولیں۔

''مگر امی۔''

''بس کوئی بات نہیں کروں گی میں تم سے۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر رعب سے بولیں۔

''جاؤ اور جا کر ڈاکٹر کو فون کرو۔''

''جی بہتر۔'' وہ شرمندہ ہو کر ڈاکٹر کو فون کرنے چلے گئے۔

ڈاکٹر آیا اجالا کو چیک کرنے کے بعد نسخہ لکھ دیا۔ سیرپ اور کیپسولز تھیں۔ سردی کا اثر تھا۔ جس کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔ صفیہ بیگم اجالا کو اپنے کمرے میں کیوں لے

آئی تھیں۔ ذیشان بہت جھنجلائے تھے۔ وہ ان کا مقصد سمجھ رہے تھے۔

''امی آپ اجالا کو اپنے کمرے میں لے آئیں؟'' وہ ان سے پوچھ رہے تھے۔

''تاکہ اس کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے۔ تمہارے کمرے میں تو یہ ڈیکوریشن پیس کی طرح ایک کونے میں پڑی رہتی ہے۔ یہ معصوم جیئے یا مرے تمہیں تو خبر بھی نہیں ہو گی۔'' صفیہ بیگم نے زبردست چوٹ کی تھی ان کا دل دہل گیا۔

''خدا کے لیے امی اتنی ظالم مت بنیں مریں اس کے دشمن اس پر تو میں آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔'' وہ بے سدھ سوئی اجالا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے قراری سے تڑپ کر بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

دوا کھانے سے اس کا بخار کم ہو گیا تھا۔ وہ دو دن سے صفیہ بیگم اور فیضان صاحب کے کمرے میں تھی۔ فیضان صاحب آفیشل کام کے سلسلے میں تین دن کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ صفیہ بیگم نے اس کا بہت خیال رکھا تھا خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے دلیہ اور سوپ بنا کر لاتی تھیں۔ وہ ان کی محبتوں پر آبدیدہ ہو گئی۔

وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اپنی ڈائری کھول کر پڑھنے لگی اس کی نظریں اس نظم پر جم گئیں۔

محبت رنگ بدلتی ہے
اور اس کا کوئی بھی رنگ مستقل
پختہ نہیں ہوتا
نوید سحر کی کوئی
دلیل بے کراں جیسے
کسی مشکل سفر میں
قافلہ اک اماں جیسے
کبھی حیران سے لہجے
کوئی دل بدگماں جیسے

جھلتی دھوپ میں سایہ
شجر مہرباں جیسے
کبھی نہ رکنے والا زندگی کا کارواں جیسے
کوئی رنگین سی
سنگین سی
اک داستاں جیسے
محبت ابتدا میں بال کھولے مسکراتی ہے
کبھی ہر نظم میں
ہر شعر میں
ہر استعارے میں
گھٹاؤں کی طرح
گھر گھر کے آتی اور برستی ہے
کبھی اک بلبلے کی طرح
پل دو پل کو ہنستی ہے
کبھی صدیوں تک
دل کے نہاں خانوں میں بستی ہے
کبھی فرد کے اندیشے
کبھی اک جوش و مستی ہے
کبھی ہنس ہنس کے روتی ہے
کبھی رو رو کے ہنستی ہے
محبت آدمی کی زندگی کا ڈھنگ بدلتی ہے
مگر خود رنگ بدلتی ہے
محبت رنگ بدلتی ہے

''میری زندگی کے بدلتے رنگوں سے ملتی جلتی ان کی عکاسی کرتی نظم ہے یہ۔

محبت نے رنگ بدلا تو محبت کرنے والا بھی بدل گیا ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ۔''

اجالا نے خود سے سوال کیا اسے اس نظم کا ایک ایک لفظ اپنی زندگی کا ترجمان، حالات کا عکاس محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک دروازے کی دستک پر وہ گھبرا گئی۔

''کم آن''۔ اس نے آہستہ سے کہا تو دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت نوجوان اندر داخل ہوا وہ اسے دیکھ کر مزید گھبرا گئی۔ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔

''السلام علیکم ڈیئر اجالا بھابی کیسی ہیں آپ؟'' آنے والے نے پھولوں کا گلدستہ اس کے سامنے کرتے ہوئے بڑے اپنائیت بھرے انداز میں اس کا حال پوچھا تو وہ حیران سی بولی۔

''آپ کون ہیں؟''

''یہ ہماری فاخرہ پھپھو کے بیٹے عمیر ہیں موصوف آرمی میں کیپٹن ہیں''۔ اس کے سوال کا جواب ذیشان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیا۔

''جی اور مابدولت اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں ماموں جان نے آپ کی اتنی تعریف کی تھی کہ میں آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا اور اپنی چھٹیاں یہاں گزارنے کے ارادے سے چلا آیا۔ کہیے طبیعت کیسی ہے آپ کی سنا ہے کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔'' وہ نان اسٹاپ بولے گیا۔

''پھر تو یہ آپ کے لیے اچھی خبر ہوئی ناسازی، طبع کے باعث دشمن آپ کے مقابل آنے سے کچھ عرصے کے لیے کترائے گا۔'' اجالا نے بکے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑا۔ ذیشان اس کے چہرے کو تک رہے تھے اس کے لفظوں پر غور کر رہے تھے۔

''آپ پڑھتی ہیں؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''جی میں نے حال ہی میں ایف۔ ایس۔ سی کیا ہے۔''

''اوہاں یاد آیا بھئی بھابی آپ نے تو ٹاپ کیا ہے ٹاپ بہت بہت مبارک ہو آئندہ کیا ارادے ہیں؟'' وہ شاید ایک وقت میں کئی سوال کرنے کا عادی تھا

بہر حال اجالا کو شرارتی سا فوجی نوجوان اچھا لگا تھا۔

''ایم۔ بی۔ اے کر کے میں اپنے پاپا کا بزنس سنبھالنا چاہتی ہوں۔''

''ویری گڈ بہت زبردست ارادے ہیں اللہ آپ کو کامیاب کرے ویسے میں یہ آپ کو آپ کس حساب میں کہہ رہا ہوں آپ تو مجھ سے چھ سات سال چھوٹی ہیں اس لیے میں آپ کو تم کہوں گا اور آپ کا نام لے کر مخاطب کروں گا کیوں اجالا ٹھیک ہے نا تمہارے دولہا میاں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا۔'' وہ کہتے ہوئے آخر میں ذیشان کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے بھلا کیوں اعتراض ہونے لگا تمہارا جو دل چاہے کہو۔'' ذیشان نے مسکرا کر کہا۔

''اجالا یہ بتاؤ کے دوست کی بیوی بن کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟'' وہ سب جانتا تھا۔ فیضان صاحب کی زبانی بھی معلوم ہو چکا تھا ان کا پرانا تعلق سو بے تکلفی سے پوچھنے لگا یہ بے تکلفی شاید اس کی طبیعت کا حصہ تھی مگر اس سوال نے اجالا کو نروس کر دیا تھا۔ اس نے بے اختیار ذیشان کو دیکھا وہ بھی اسی کو دیکھ رہے تھے اس کے جواب کے منتظر لگ رہے تھے۔

''بہت اکیلے پن اور اجنبیت کا احساس ہو رہا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''حالانکہ یہ رشتہ تو بہت مضبوط اور اجنبیت کی ہر دیوار سے بالاتر ہوتا ہے''۔ عمیر نے حیران ہو کر کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''ہوتا ہوگا''۔

''لگتا ہے بھائی جان آپ نے بھابی جان کو اس رشتے کی مضبوطی اور خوبصورتی کا احساس نہیں دلایا ابھی تک''۔ وہ ذیشان کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو اجالا جوم سی ہو کر وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی اور اس کے جاتے ہی ذیشان نے عمیر کی کمر پر مکا رسید کر دیا۔

''بے شرم کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ بھی کر لیا کر جو منہ میں آتا ہے بکے جاتا

ہے''۔

''سوری بھائی جان مجھے خیال نہیں رہا۔'' وہ شرمندگی سے ہنس کر بولا تو وہ بھی ہنس پڑے۔

عمیر کی طبیعت بہت شوخ تھی وہ بہت سلجھا ہوا مگر شرارتی نوجوان تھا۔ اجالا سے اس کی دو دن میں ہی خوب دوستی ہوگئی۔ کالج میں گیمز اور دوسرے فنکشن شروع ہو گئے تھے اس لیے اجالا نے چھٹی چھٹی لے لی۔ وہ عمیر کی کمپنی میں خوب انجائے کر رہی تھی۔ ذیشان دیکھ رہے تھے کہ اجالا کے لبوں پر کتنے مہینوں کے بعد پہلے جیسی مسکراہٹ اور ہنسی سجی ہے اور یہ سب عمیر کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر وہ خوش بھی تھے اور بے کل بھی۔ عمیر کے ساتھ ہنسنا بولنا کھیلنا آئس کریم کھانا برگر اور پزا منگوانا اجالا کا معمول بن گیا تھا۔

عمیر کے آنے سے اجالا اور ذیشان میں فاصلے ا بھی بڑھ گئے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اجالا کو ان کی فکر نہیں تھی وہ اب بھی ان کی چیزوں کا خیال رکھتی تھی مگر انہیں پتا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ ان کے دیر سے آنے پر فکرمند ہو جاتی تھی۔ مگر ان سے کہتی نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو یہ کہہ کر بہلانے کی کوشش کرتی کہ شاید یہ فاصلے ذیشان کو اس کے قریب آنے کا موقع دے سکیں۔ وہ پھر سے اس کے لیے سراپا محبت بن جائیں۔

شام کو گھر ذیشان آئے تو وہ عمیر کے ساتھ صحن میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے ڈھیروں رنگ دمک رہے تھے اور ایک دم ہی وہ ہنسنے لگی تو جیسے چار سو جلترنگ بجنے لگے وہ عمیر سے کہہ رہی تھی۔

''ہار گئے نا آپ اب کھلایئے آئس کریم اور پزا۔''

''چلو ڈیئر تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس فوجی بندے نے تمہیں جتوایا ہے۔'' عمیر نے بڑے شوخ انداز میں کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''آیئے بھائی جان صحیح وقت پر پہنچے ہیں آپ۔'' عمیر نے ذیشان پر نظر پڑتے

ہی کہا۔

''خیریت''۔ انہوں نے اسے اور پھر اجالا کو دیکھا جو اپنا دوپٹہ درست کر رہی تھی۔

''اجالا نے مجھے ہرا دیا ہے اب میں اسے وعدے کے مطابق آئس کریم کھلانے لے جا رہا ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔''

''میں تو بہت تھک گیا ہوں آرام کروں گا اور آئس کریم تم نہیں کھلاؤ گے اسے بہت ٹھنڈ ہے یہ پھر سے بیمار پڑ جائے گی۔'' ذیشان نے سنجیدگی سے کہا۔

''پزا تو چلے گا نا ڈیئر''۔ عمیر نے اجالا کے چہرے کو دیکھا۔

''بالکل لیکن پزا لینے ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ظاہر ہے اب تمہارے میاں صاحب جو تشریف لے آئے ہیں تمہیں ان کی بھی کچھ خاطر داری کرنا ہوگی وہ شرارت سے بولا۔''

''پزا لائیں جا کر۔'' اجالا نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو اسے ریکٹ مارتے ہوئے کہا۔

''جا رہا ہوں ویسے ۔ ئی جان''۔ وہ ہنستے ہوئے بولا اور پھر ذیشان سے کہنے لگا۔

''آپ بہت لگی ہی دیر آید درست آید محاورہ آپ کی دلہن کو دیکھ کر بالکل درست لگتا ہے۔ بھائی جان مجھے بھی اجالا جیسی کوئی پری پیکر، حسن و جمیل، سراپا غزل، حور شمائل، مجسم حسن، نازنیں ڈھونڈ دیں تاکہ میں بھی اپنے سہرے کے پھول کھلا سکوں''۔

''تم نے بہت دیر کر دی صاحبزادے ڈیڑھ ماہ پہلے آ جاتے تو یہ خوش قسمتی تمہارا مقدر بن سکتی تھی۔ تمہارا چانس بن سکتا تھا اب ایسی اجالا صفت اور کہاں ہوگی ڈھونڈنا بیکار ہے''۔ ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا تو اجالا کا دل ٹوٹ گیا۔

''ہاں یہ تو ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اجالا جیسی اور کہاں؟''

''ذیشان آپ میرے شوہر ہو کر ایسی بات کر رہے ہیں آپ کو عمیر بھائی سے اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ مجھ سے شادی کر کے پھنس گئے ہیں خوش نہیں ہیں ورنہ یہ بات کبھی نہ کہتے۔ یعنی اگر عمیر بھائی پہلے یہاں ہوتے تو یہ میری شادی ان سے کر دیتے۔ مجھے تو مجبوراً اپنایا ہے انہوں نے''۔ اجالا ان کی بات سنتے ہی دکھ سے انہیں دیکھ کر اندر چلی آئی اور کچن تک آتے آتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بس یہ سب سوچ ہی سکی تھی ذیشان سے کہہ نہیں سکی تھی۔

عمیر پزا لینے چلا گیا تو ذیشان بھی اندر آ گئے۔ انہیں اجالا کے چہرے پر یکا یک چھا جانے والا دکھ بے چین کر دیتا تھا۔ انہوں نے اس کی تلاش میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی مگر وہ انہیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''آ گئے بیٹا''۔ صفیہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو انہیں دیکھ کر بولیں۔

''جی امی السلام علیکم''۔

''وعلیکم السلام بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔'' صفیہ بیگم نے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کام بہت تھا امی چائے تو پلوائیں اچھی سی۔''

''اجالا بنا رہی ہے یہ چائے یہ عمیر کہاں گیا؟''

''اجالا سے ہار گیا ہے گیم میں اب اس کے لیے پزا لینے گیا ہے۔'' ذیشان بولے۔

''عمیر کے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی ہے زندگی سی لوٹ آئی ہے اجالا میں تم نے دیکھا اجالا کتنی خوش رہتی ہے عمیر کی کمپنی میں۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔

''جی ہاں امی اور میرے خیال میں اجالا کے لیے عمیر جیسا جیون ساتھی ہی ہونا چاہیے۔'' ذیشان نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' صفیہ بیگم نے ڈپٹ کر کہا۔

''تم میں کیا کمی ہے عمیر سے کہیں زیادہ لونگ، کیئرنگ اور جولی ہو تمہاری زندہ

دلی کی تو مثال دی جاتی ہے خاندان بھر میں اور اجالا کے ساتھ تمہارا جو ہنسی مذاق، شرارتیں کرنا چلتا تھا وہ کیا ہم سے پوشیدہ ہے تم نے اس سے شادی کے بعد سے چپ سادھ رکھی ہے ورنہ اس گھر میں کون تھا میرے یا تمہارے ابو کے علاوہ جو ہمیں ہر وقت خوش رکھتا تھا۔ تمہارے دم سے ہمیں کبھی اپنے گھر میں ویرانی، خالی پن یا اداسی کا احساس نہیں ہوا۔ اب نجانے تم نے اس شادی کو دل سے قبول کیوں نہیں کیا ایسا کب تک چلے گا بیٹا؟''

''پتا نہیں امی میں بہت تھک گیا ہوں۔'' وہ سر صوفے کی بیک پر رکھ کر تھکے تھکے لہجے میں بولے تو انہوں نے کہا۔

''فضول کی سوچیں پالو گے تو تھکو گے ہی۔''

''یہ لیجیے چائے۔'' اجالا چائے اور سینڈوچز، کباب وغیرہ ٹرالی میں سجا کر لے آئی۔

''تھینک یو۔'' ذیشان نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔ صفیہ بیگم انہیں آپس میں بات کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں اس لیے نماز کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

ذیشان نے اجالا کے چہرے کو دیکھا جہاں اب شادابی اور خوشی کی جگہ اداسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ بالوں کی دو چوٹیاں آگے پڑی تھیں کٹے ہوئے چند بالوں کی لٹیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں وہ انہیں اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہوئی۔ اس نے خاموشی سے انہیں کباب اور سینڈوچ پیش کیے اور چائے کا کپ لے کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

''شام کی چائے روز تم کیوں بناتی ہو ملازمہ سے کہہ دیا کرو۔'' انہوں نے چائے کا سپ لے کر کہا حالانکہ انہیں اس کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی مگر بات کرنے کو یہی موضوع سوجھا تھا۔

''زندگی گزارنے کے لیے کوئی مشغلہ تو ہو۔'' اجالا نے چائے کے کپ کے کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے آہستگی سے کہا تو وہ قدرے شرمندہ سے ہو گئے۔

''تم نے کالج جوائن کر لیا مجھے بتایا بھی نہیں اپنے رزلٹ کا بھی نہیں بتایا۔'' وہ گلہ کر رہے تھے یا ناراضگی کا اظہار وہ سمجھ نہ سکی اور سنجیدگی سے بولی۔

''حالانکہ پہلے مجھے میرا رزلٹ ہمیشہ آپ بتایا کرتے تھے اور آپ نے پوچھا ہی کب تھا جو میں بتاتی ویسے بھی الحمدللہ میرا رزلٹ ایسا تھا کہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی سب کو علم تھا سوائے آپ کے۔'' اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''میں لاعلم تو نہیں تھا گڑیا میں تو تمہارا منتظر تھا کہ تم مجھے خود بتاؤ گی۔'' انہوں نے دل میں کہا۔

''ایڈمشن ابو نے کرایا تھا آپ مصروف تھے ان دنوں اس لیے آپ سے بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ آئی ایم سوری ویسے آپ کو میرے پڑھنے پر تو اعتراض نہیں ہے نا۔'' اجالا نے خود ہی بات بتاتے ہوئے آخر میں ان کی صورت دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بلکہ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے پاپا کا بزنس سنبھالنا چاہتی ہو۔''

ذیشان نے دل سے کہا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

''ہیلو ایوری باڈی پزا حاضر ہے ...... ہیں یہ کیا میرے بغیر ہی چائے نوش فرمائی جا رہی ہے۔ میں گرم گرم پزا لے کر آیا ہوں۔'' اسی وقت عمیر چھلاوے کی طرح اندر داخل ہوا اور انہیں چائے پیتے دیکھ کر بچوں کی طرح منہ بنا کر بولا ذیشان ہنس کر بولے۔

''چائے ابھی گرم ہے تم پزا لاؤ ادھر تا کہ چائے کا لطف دوبالا ہو سکے۔''

''لیجیے بھائی جان اور اجالا جان یہ پزا پہلا پیس تمہارے لیے افتتاح تم سے ہو گا کیونکہ وہ کہتے ہیں ناں کہ لیڈیز فرسٹ۔'' عمیر نے پزا پلیٹ میں نکال کر ایک ٹکڑا اجالا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو۔'' اجالا نے پیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''آپ بھی لیں ناں بھائی جان یہ ممانی جان اور ماموں جان کہاں ہیں؟''

عمیر نے پلیٹ ذیشان کے سامنے کرتے ہوئے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔
ذیشان کا دھیان تو عمیر کے اجالا کو انتہائی بے باکی اور بے تکلفی سے ان کے سامنے ہی اجالا جان کہنے پر اٹکا ہوا تھا۔ ان سے کچھ کھانا تو درکنار چائے پینا بھی مشکل ہوگئی۔ وہ بمشکل کپ خالی کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''ان کا موڈ ایک دم آف کیوں ہوگیا۔'' اجالا نے فکر مند ہو کر سوچا۔ اس کا بھی اب وہاں بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صفیہ بیگم اور فیضان صاحب کے آتے ہی وہ بھی وہاں سے اٹھ کر بیڈ روم میں آگئی۔ ذیشان صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جس کا دھواں ان کے اطراف پھیل رہا تھا۔

اجالا کو یاد آیا کہ جب وہ بہت زیادہ پریشان ہوتے اور کسی مسئلے کا فوری اور مناسب حل ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا تھا تو تب وہ سگریٹ پھونکنے لگتے تھے اور وہ ہمیشہ ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر مسل کر پھینک دیا کرتی تھی اور وہ ہنس پڑتے تھے۔ آج وہ میں اتنی ہمت اور جرات نہیں پارہی تھی کہ ان کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیتی مگر پھر بھی اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''کیا کوئی پریشانی یا پرابلم ہے؟''

''نہیں تو۔'' انہوں نے حیران ہو کر اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو آپ سگریٹ کیوں پی رہے ہیں؟'' وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''یونہی'' انہوں نے سگریٹ کی راکھ میز پر رکھے ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

''یونہی تو نہیں ضرور کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے آپ سگریٹ ایسے ہی تو نہیں پی رہے۔'' اس نے نرم اور مدھم لہجے میں کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''تمہیں یاد ہے میری یہ عادت اور اس کا سبب۔''

''مجھے تو سب یاد ہے لیکن شاید آپ بھول رہے ہیں۔'' اجالا نے معنی خیز لہجے

میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ذیشان نے بغور دروازے کو دیکھا اور پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔ انہیں یاد آرہا تھا کہ انہوں نے اس سے سگریٹ نہ پینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ انہیں ان کا وعدہ یاد دلا گئی تھی۔

''آئی ایم سوری گڑیا بھولا تو میں بھی نہیں ہوں اور کیسے بھول سکتا ہوں تمہارے پیار اور احتیاط بھری باتیں۔ اب نہیں پیوں گا پکا وعدہ ہے اب نہیں پیوں گا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے دل میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا اور صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

''اجالا چلو سسٹر بھابی آج ذرا مارکیٹ کا چکر ہو جائے کل تو میں چلا جاؤں گا تمہارے لیے کچھ گفٹس خریدنے ہیں تمہاری پسند سے کیونکہ مجھے تو لڑکیوں کی پسند کا کچھ خاص علم نہیں ہے۔'' عمیر نے اگلے دن ناشتے کے بعد تیار ہو کر اس سے کہا۔

''گفٹس کی کیا ضرورت ہے بھائی چھوڑیں اس تکلف کو۔'' اجالا نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تکلف تو تم کر رہی ہو سسٹر بھابی آخر میرا ابھی تو کچھ حق ہے تم پر ڈبل رشتے ہیں اور گفٹس تو تمہارا حق بنتے ہیں میں تمہاری شادی میں بھی نہیں آسکا لیکن تمہیں میری شادی میں ضرور آنا ہے سمجھیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ کی بارات کب اور کہاں جائے گی؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اللہ جانے ابھی تو زور و شور سے اس سورج کے لیے چاند سی دلہن کی تلاش جاری ہے دعا کرو واپسی تک تلاش میں کامیاب ہو گئی ہو'۔ اس نے اپنے چہرے پر شرارت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''انشاء اللہ کیوں نہیں آپ کو آپ جیسی اچھی لڑکی ہی ملے گی۔'' اس نے دل سے کہا۔

''مجھ جیسی؟ میں کیا لڑکی ہوں؟'' وہ مذاق سے بولا تو وہ ہنس پڑی۔

''آپ لڑکے بہت اچھے بہت کمال کے ہیں۔''

''ارے جیتی رہو سسٹر بھابی تم نے دل خوش کر دیا اب اسی خوشی میں میرے ساتھ مارکیٹ چلو اور اپنی پسند سے شاپنگ کرو تاکہ میری یعنی تمہارے دیور بھائی جان کی کوئی نشانی یادگار تمہارے پاس موجود ہو۔ اسلام آباد سے تو تمہارے لیے شاپنگ ضرور کروں گا ذرا یہاں تجربہ کرا دو چلو شاباش ہری اپ۔''

''آپ خود چلے جائیں ناں۔'' وہ اس کے ساتھ ابھی تک گھر سے باہر کہیں نہیں گئی تھی اس لیے ہچکچاتے ہوئے بولی تو قریب بیٹھی صفیہ بیگم نے کہا۔

''اجالا بیٹا چلی جاؤ نا بھائی اتنے پیار سے کہہ رہا ہے۔''

''اور کیا؟'' عمیر نے کہا تو وہ ہنس دی۔

''اچھا میں ان سے پوچھ لوں۔'' اجالا کا اشارہ ذیشان کی طرف تھا وہ فوراً سمجھتے ہوئے بولا۔

''وہ کیا منع کریں گے؟''

''نہیں لیکن انہیں بتانا اور ان سے پوچھنا، اجازت لینا میرا فرض ہے۔'' اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا تو صفیہ بیگم نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''بہت سمجھدار ہے میری بیٹی۔''

''اور میری بہن اور بھائی''۔ عمیر نے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑیں عمر سمیت۔
اجالا نے اپنے کمرے میں آکر ذیشان کے آفس کا نمبر ملایا تو فون انہوں نے ہی ریسیو کیا۔

''ہیلو ذیشان اسپیکنگ''۔

''میں بول رہی ہوں اجالا۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''اجالا خیریت تو ہے تم نے یہاں کیسے فون کیا؟'' وہ اس کی آواز سنتے ہی حیران ہو کر بولے۔

''وہ آپ سے اجازت لینی تھی۔''

''کیسی اجازت؟''

''عمیر بھائی مجھے مارکیٹ شاپنگ کے لیے لے جانا چاہ رہے ہیں اگر آپ کی

اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ چلی جاؤں''۔

''بھئی چلی جاؤ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''اور کس سے پوچھوں؟'' اجالا نے بے ساختہ سوال داغا تو چند سیکنڈ کو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور پھر ذرا سنبھل کر بولے۔

''گھر میں امی موجود ہیں ان سے پوچھ لیا ہوتا۔''

''امی نے پوچھنے سے پہلے ہی جانے کا کہہ دیا تھا۔'' اس نے سنجیدہ اور مدھر لہجے میں بتایا۔

''تو جاؤ گڑیا انجائے کرو بائے۔'' یہ کہہ کر ذیشان نے فون بند کر دیا۔

''میں تو آپ کے ساتھ انجائے کرنا چاہتی ہوں شانی۔'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا اسے اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ عمیر اسے پکار رہا تھا۔ خود کو مضبوط بناتے ہوئے لبوں پر مسکان اور آنکھوں پر سن گلا سز سجا کر وہ باہر آ گئی اور عمیر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر مارکیٹ کی جانب چل دی۔

عمیر نے اسے اس کی پسند کا ایک سوٹ خرید کر دیا۔ پرفیوم، جیولری سیٹ، چوڑیاں، جوتے اس کی پسند کی شاعری کی کتاب اور قلم اسے گفٹ کیا جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا وہ بھی اس کے لیے کچھ خریدنا چاہتی تھی مگر ذیشان سے پوچھے بغیر دینا نہیں چاہتی تھی سو مسکرا کر بولی۔

''آپ کے لیے تو ہم دونوں اپنی پسند سے گفٹ خریدیں گے اور اسلام آباد آ کر دیں گے۔''

''اسلام آباد تم ضرور آنا گفٹ کی خیر ہے دل میں محبت ہونی چاہیے بھائی کی۔''

''وہ تو ہے''۔ اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''جیتی رہو بہنا خدا تمہارے من کی ہر مراد پوری کرے تمہیں ازدواجی زندگی کا سکھ دے۔''

کو پگھلانے کے لیے ان تحفوں کو ڈھال بنانے کا سوچ کر ان کے لیے یہ سب لائی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی بات سنے بغیر ہی رائے دے دی تھی۔

''اجالا اگر تمہیں ہمیشہ کے لیے عمیر کے ساتھ رہنا پڑے تو رہ لوگی؟'' انہوں نے اس کی حالت اور کیفیت جانے بغیر ایک اور نشتر اس کے دل میں چبھو دیا۔

''مم...... میں سمجھی نہیں؟'' وہ اور کیا کہتی یہی لفظ اس کا سہارا بنے۔

''اگر میں تمہاری شادی عمیر سے کرادوں تو؟''

''اسٹاپ اٹ پلیز۔'' اجالا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے چیخ کر کہا اسے ایسا لگا جیسے انہوں نے اسے بہت بلندی سے اٹھا کر کسی گہری پستی میں لا پٹخا ہو۔ اسے ان سے اس قسم کے سوال کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا کہ سب کچھ ختم کردے اور خود بھی ختم ہو جائے۔

''آپ...... آپ نے۔'' وہ بول ہی نہ سکی آنسوؤں نے آنکھوں میں بند باندھ دیا تھا۔ وہ بے قراری سے اٹھی اور میز پر رکھا گلاس اٹھا کر اس قدر غصے سے میز پر مارا کے گلاس چکنا چور ہو گیا اور وہ اپنے چکنا چور دل کو سنبھالے بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اجالا میری بات سنو گڑیا اجالا''۔

ذیشان اسے آوازیں دیتے رہ گئے مگر وہ رکی نہیں تھی وہ پریشان ہو کر کمرے سے باہر آئے اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر وہ شاید دوسرے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ صفیہ بیگم فیضان صاحب اور عمیر اپنے اپنے کمروں میں تھے ورنہ ابھی ان کی شامت آجاتی۔ وہ کچھ شرمسار بھی تھے اپنی اس بات پر انہیں اجالا کے اس قدر شدید ردعمل کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ تو اسے عمیر کے ساتھ خوش دیکھ کر پوری نیک نیتی سے یہ بات کہہ گئے تھے۔ انہیں اس پر شک نہیں تھا وہ تو معصوم تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر بھی انہوں نے اس کی خوشی کے لیے یہ بات سوچ کر اس کے سامنے کہہ دی تھی اور اس کا ردعمل دیکھ کر انہیں شرمندگی ہو رہی تھی۔ اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا اپنی کہی بات پر افسوس ہو رہا تھا۔

''ذیشان آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ مجھے کیا سمجھا ہے آپ نے میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہو آپ نے اتنا پیار دیا تھا کبھی مجھے آج آپ نے مجھے مار دیا ہے عمیر بھائی کو تو میں نے دل سے اپنا بھائی ہی سمجھا ہے اور آپ نے؟ چلی جاؤں گی میں یا جیسے میرے مما پاپا نہیں رہے تو کیا ہوا ان کا گھر تو اب بھی میرا ہے میں شہاب ولا چلی جاؤں گی پھر آپ دوسری شادی کر لیجیے گا جس کو آپ پسند کرتے ہیں میں اپنی کم عمری کے باعث آپ کے مقابل نہیں آسکتی۔ اس میں میرا کیا دوش ہے آپ کی مرضی نہیں تو انکار کر دیا ہوتا مجھے یوں ذلیل اور نظر انداز کرنے کا کس نے حق دیا تھا آپ کو؟ سنا تھا کہ محبت رنگ بدلتی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ محبت بدگمان بھی ہو جاتی ہے، ختم بھی ہو جاتی ہے جیسے آپ کی محبت ذیشان آپ کی محبت میرے لیے ختم ہو گئی ہے نا جبھی تو آپ نے مجھ سے یہ بات کہی، آپ کی محبت نے رنگ ضرور بدلا مگر کوئی نیا رنگ نہ اپنا سکی۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتی چلی جاؤں گی کل یہاں سے۔'' وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی بلک بلک کر تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

رات ڈھلتی گئی۔ چاند بجھتا گیا، اجالا کا دل ٹھہر سا گیا تھا اس سورج جیسا شخص کے لفظوں کے شعلوں نے اس کے چہرے کے پھول مرجھا دیئے تے۔ درد کا درد موسم اس کے جسم کی ہری ٹہنیوں میں اتر گیا تھا اور محبت بھرا دل کانچ کی چوڑیوں کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ وہ سسکتی رہی، تڑپتی رہی۔

''میں صبح عمیر بھائی کے جانے کے بعد یہاں سے چلی جاؤں گی کالج کے لیے نکلوں گی مگر اپنے گھر جاؤں گی۔'' ذیشان کے اس رویے نے اسے منفی انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

صبح وہ رات بھر روتے اور جاگنے کے سبب بہت مشکل سے اٹھ سکی۔ نہا کر کالج یونیفارم پہن کر تیار ہو گئی۔ ناشتے کی میز پر ذیشان نے اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہے۔ اس کی شربتی آنکھوں میں لالی اور

سوجن نمایاں تھی وہ اپنے شانوں پر بکھرے بالوں کی طرح خود بھی بکھری بکھری سی لگی ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ جاگے تو وہ بھی تھے رات بھر ان کی آنکھوں میں بھی سرخ لکیروں کا جال سا بچھا تھا۔ عمیر کی خاطر وہ دونوں ہی خود کو نارمل رکھتے ہوئے اس سے باتیں کررہے تھے۔ صفیہ بیگم اور فیضان صاحب عمیر کو ائیر پورٹ چھوڑنے جارہے تھے۔

''تم اجالا کو کالج ڈراپ کردینا شانی بیٹا۔'' فیضان صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابو پہلے عمیر کو ائیر پورٹ ڈراپ کردیں۔'' ذیشان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم بھی چلو اجالا بیٹا تیار ہو کالج کے لیے۔'' فیضان صاحب نے اجالا کی طرف دیکھا۔

''ابو میں دیر سے جاؤں گی میرے پہلے دو پیریڈز فری ہیں آج۔'' اس نے فوراً بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''او کے بیٹا چلو عمیر میاں اپنا سامان لے آؤ۔'' وہ عمیر سے کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

صفیہ بیگم اور ذیشان باہر چلے گئے۔ اجالا بھی خاموشی سے عمیر کے ساتھ باہر آ گئی۔ عمیر ان تینوں سے مل کر اس کی طرف آیا تو اس کی آنکھیں خود بخود چھلک پڑیں۔

''ارے رے اجالا میری گڑیا سی بہنا رونا نہیں پلیز دیکھو تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں ستارے جھلملاتے اچھے لگتے ہیں اور میں کوئی محاذ جنگ پر تھوڑی جارہا ہوں پھر آؤں گا اپنی سویٹ سسٹر اور کیوٹ بھابی سے ملنے اور تمہیں فون بھی کیا کروں گا خط بھی لکھوں گا جواب دو گی نا؟

عمیر نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر پیار سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ذیشان کو عمیر کی زبان سے اجالا کے لیے سسٹر اور بھابی کے الفاظ سن کر اپنی کہی ہوئی بات پر بے حد ندامت محسوس ہوئی وہ ان کی بے تکلفی کو کیا سمجھے تھے اور

بات کیا نکلی تھی۔ ان میں اجالا سے نظریں ملانے کی تاب نہ تھی۔

''بھائی جان میری اس سویٹ سسٹر اور کیوٹ بھابی کا آپ نے بہت خیال رکھنا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ اسے بالکل بھی وقت نہیں دیتے ہر وقت بزنس میں الجھے رہتے ہیں۔ یہ میری بہن کے ساتھ سراسر زیادتی ہے اتنی پیاری بیوی سے بھی بھلا کوئی منہ موڑتا ہے یہ میری بہن بھی ہے میری کوئی بہن نہیں تھی اور اجالا کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ سو ہم نے ایک دوسرے کو بھائی، بہن کے رشتے میں جوڑ لیا ہے۔ اس لیے یہ گڑیا میری بھابی کم بہن زیادہ ہے خبردار میری بہن کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔'' عمیر نے نان اسٹاپ بولتے ہوئے انہیں حیرتوں اور ندامتوں میں ڈبو دیا تھا۔ اجالا نے ان کے چہرے کو دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں جو ملال، جو گلے، شکوے تھے وہ ذیشان سے چھپے نہ رہ سکے اور وہ نظریں چرا گئے۔

''اچھا سرکار نہیں پہنچے گا اب اسے کوئی دکھ تم چلنے والے بنو ورنہ تمہاری فلائٹ مس ہو جائے گی۔'' ذیشان نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور میں آپ سب کو خاص کر اجالا کو بہت مس کروں گا۔''

''بھائی جان آپ بھی اسلام آباد کا پروگرام بنالیں ہنی مون کے بہانے ہی چلے آئیں وہاں۔'' عمیر نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ ہنس پڑے۔

''تم باز مت آنا شیطان''۔ ذیشان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ہنس پڑا اور پھر اجالا سے مخاطب ہوا۔

''سسٹر تم نے کل جو ان کے لیے گفٹس خریدے تھے انہیں پسند آئے یا نہیں؟''

''یہ تو آپ ان ہی سے پوچھیے''۔ اجالا نے ذیشان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''او مائی گاڈ۔'' ذیشان مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گئے۔

''تو وہ چیزیں اجالا نے میرے لیے خریدی تھیں اور میں نے اس کی بات سننے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اسے ٹوک کر اپنی ہی ہانکتا رہا ہاؤ اسٹوپڈ آئی ایم۔''

''کہاں پہنچ گئے بھائی جان؟'' عمیر نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''کہیں نہیں چلو دیر ہو رہی ہے''۔ وہ سر جھٹک کر گاڑی کی طرف چلے گئے۔

''اوکے سسٹر ٹیک کیئر اپنا خیال رکھنا اور اسلام آباد ہمارے گھر ضرور آنا اس گھر کو اپنے بھائی کا گھر ہی نہیں اپنے مما پاپا کا گھر بھی سمجھانا، سمجھو کے اب میرا گھر تمہارا میکہ ہے کوئی پرابلم ہو تو اپنے بھائی سے ضرور شیئر کرنا۔'' عمیر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت اور نرمی سے کہا۔

''اوکے تھینک یو بھائی اللہ حافظ۔'' اجالا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آنسو رخساروں پر پھیل گئے۔ جنہیں عمیر نے اپنے رومال سے صاف کیا اور اللہ حافظ کہہ کر گاڑی میں جا بیٹھا وہ چاروں گاڑی میں بیٹھ کر فیضان ولا کا گیٹ عبور کر گئے تو وہ دوڑتی ہوئی ذیشان کے بیڈ روم میں آ گئی وہ ان کے ایئر پورٹ سے واپسی سے پہلے اپنا سامان سمیٹ کر یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے اپنی جیولری، چوڑیاں، پرفیومز اور لوشن وغیرہ اٹھا کر ایک لفافے میں ڈالے اور اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ ہیئر بینڈ اٹھا کر بالوں کی اونچی پونی بنالی۔ اس اسٹائل میں وہ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ کالج کی بجائے سکول گرل دکھائی دے رہی تھی اور وارڈ روب سے جلدی جلدی اپنے کپڑے نکال رہی تھی اور بے آواز بول رہی تھی آواز اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''میں نے کوئی منتیں تو نہیں کیں تھیں ان کی شادی کے لیے شادی کرتے ہی بدل گئے مجھے بھی نہیں رہنا یہاں جا رہی ہوں میں یہاں سے''۔

''کہاں جا رہی ہے میری ڈارلنگ بے بی؟'' ذیشان کی نرم محبت بھری آواز نے اسے چونکا دیا وہ ٹپٹا کر مڑی تو سامنے انہیں کھڑے دیکھا سیاہ پینٹ پر ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ پہنے ہوئے ان کی گندمی رنگت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ وہ لبوں پر مسکان سجائے اسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی مسکراہٹ پر حیران ہو رہی تھی۔

''یہ ایئر پورٹ سے اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟'' اجالا نے حیران ہو کر سوچا۔

''میں ایئر پورٹ گیا ہی نہیں باہر گاڑی پہنچا کر واپس آ گیا ہوں۔'' وہ اس کی حیرت کا سبب محسوس کرتے ہوئے خود ہی بتا رہے تھے۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے اپنی چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ ذیشان نے دیکھا اس کا سوٹ کیس بیڈ پر رکھا تھا اور وہ اپنی چیزیں کپڑے وغیرہ اس پر ٹھونس رہی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو گڑیا؟'' انہوں نے اس کے قریب آتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''اپنے مما پاپا کے گھر''۔ اس نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

''لیکن کیوں اجالا یہاں کیا ہے؟'' وہ بے قرار ہو گئے اس کے جانے کا سن کر۔

''آپ بتایئے یہاں کیا ہے میرے لیے؟'' وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولی۔

''آپ کی سرد مہری، بے رخی، بے اعتنائی، لاتعلقی کے سوا کیا ہے یہاں میرے لیے۔ مقصد اگر محض چار دیواری میں رہنا ہے تو میرے لیے میرے مما پاپا کے گھر کی چار دیواری بہت ہے وہاں کم از کم یہ لاتعلقی اور بے گانگی تو نہیں ہوگی نا۔''

''بہت خفا ہو مجھ سے اپنے شانی سے''۔ وہ اس کے قریب آ کر مدھم لہجے میں بولے۔

''آپ میرے کچھ نہیں لگتے اگر کچھ لگتے تو یوں مجھ سے بے اعتنائی نہ برتتے''۔

''اجالا گڑیا میں اب بھی تمہارا ہوں دل و جان سے تمہارا ہوں۔'' انہوں نے اس کے شانوں کو تھام کر پیار سے یقین دلانا چاہا۔

''جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔'' اس نے ان کے ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے نم لہجے میں کہا۔

"اگر آپ میرے تھے تو مجھ سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا تھا کہ آپ نے لاتعلقی کی چادر تان لی عدم دلچسپی کی بکل مار لی بتائیے کیا خطا تھی میری؟" وہ اپنا قصور پوچھ رہی تھی اور وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہوئے جا رہے تھے۔

"اجالا تمہاری کوئی خطا نہیں اور گڑیا قصوروار تو میں بھی نہیں تھا یہ تو قسمت کا کھیل تھا میں جو اتنے برس تک تمہیں اپنے دوست کی بیٹی اپنی ننھی سی دوست سمجھتا رہا تھا یوں اچانک تمہیں اس رشتے کے حوالے سے قبول کرنا میرے لیے بہت پریشان کن ہی نہیں عجیب بھی تھا۔ تمہیں اور مجھے ہم دونوں کو اس رشتے کے حوالے سے ایک دوسرے کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے تھا نا۔ تم میری احتیاط اور گریز کو میری بے رخی سمجھتی رہی۔" وہ پیار سے اسے سمجھا رہے تھے۔

"آپ پہلے کی طرح دوست بن کر تو رہ سکتے تھے نا آپ نے تو مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ میں کسی فالتو شے کی طرح آپ کے کمرے کے کونے میں پڑی رہی آپ کو میرا خیال نہیں آیا۔" وہ ناراض اور بھیگے لہجے میں بولی۔

"ہر وقت تمہارا ہی تو خیال رہتا تھا مجھے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولے۔

"جھوٹ آپ تو مجھ سے شادی پر راضی ہی نہیں تھے امی کے کہنے پر ہاں کی تھی آپ نے۔"

اس نے اسی لہجے میں کہا۔

"تو تم اس وقت جاگ رہی تھیں۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تو میری ڈارلنگ بے بی تم نے میری کہی باقی باتیں بھی ضرور سنی ہوں گی جو میں نے تمہاری محبت میں ڈوبے لہجے میں کہی تھیں؟" وہ اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولے۔

"جی۔" وہ اتنا ہی بولی تو انہوں نے کہا۔

"پھر بھی خفا ہو مجھ سے۔"

"آپ نے خوش کب رکھا مجھے میں نے تو نہیں چاہا تھا کہ میں آپ پر زبردستی مسلط ہو جاؤں کاش اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ ہوتی کہ میں آپ سے شادی کرنے سے انکار کر سکتی آپ کو یقیناً اپنی کسی ہم عمر لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی اور یقیناً آپ کسی کو پسند بھی کرتے ہوں گے میں آپ کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کاش آپ نے مجھ سے کہا تو ہوتا۔ میں آپ کے راستے سے خود ہی ہٹ جاتی۔ میں اتنی خودغرض تو نہیں تھی کہ آپ کی خوشی کی راہ میں حائل ہو جاتی۔ ماما پاپا کے بعد اس دنیا میں آپ وہ واحد ہستی ہیں جسے میں نے اپنا سب کچھ سمجھا ہمیشہ اور جب مما پاپا نہیں رہے تو میری ساری محبتیں صرف آپ کے وجود سے آپ کی ذات سے منسوب ہو گئیں آپ کے سوا کوئی بھی تو نہیں تھا میرا پھر آپ نے بھی مجھے اکیلا کر دیا اتنا مضبوط تعلق جوڑ کر اتنی لاتعلقی کا اظہار کیا کہ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔

میں آج بھی آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اسی لیے میں یہاں سے جا رہی ہوں تا کہ آپ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لیں اور میں یہاں سے سوائے اپنی چند چیزوں کے کچھ نہیں لے جا رہی۔ ہاں آپ کا نام اپنے کے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ خدا کے لیے یہ میرے ساتھ رہنے دیجیے گا یہ مجھ سے مت چھینیے گا جیسے آپ نے مجھ سے میرے دوست شانی کو چھین لیا۔"

وہ بولتے بولتے آخر میں اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ذیشان نے تڑپ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔

"اجالا میری جان میری گڑیا تم سے تمہارے دوست کو کسی نے نہیں چھینا اور میں آج بھی تمہارا ہوں تمہاری محبت میرے دل میں آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ تم تو بہت سمجھدار ہو اتنی سی بات نہیں سمجھتیں کہ میں تم سے قریب ہونے کی خاطر ہی تو تم سے کچھ عرصے کے لیے دور ہوا تھا۔ دور نہ ہوتا، فاصلہ نہ رکھتا تو مجھے کیسے اندازہ ہوتا کہ میں اجالا کو اپنی بیوی کے روپ میں بھی بہت شدت سے چاہتا ہوں اور اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

''اسی لیے اسے عمیر سے شادی کا مشورہ دے رہے تھے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''جانی صرف تمہاری خوشی کی خاطر تمہیں اس کے ساتھ خوش دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید تم نے مجھے دل سے ذہن سے قبول نہیں کیا اس لیے تم اس کے ساتھ خود کو بہتر فیل کر رہی ہو اور اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو۔''

''میں آپ کے ساتھ تو کبھی ناخوش نہیں رہی تھی مگر آپ نے مجھے یہاں لا کر خوش رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔'' وہ اسی لہجے میں شکوہ کرتی بولی۔

''وجہ میں بتا چکا ہوں گڑیا''۔

''میرا سامنا نہ کرنے کے لیے راتوں کو دیر سے گھر آتے تھے۔'' اس نے ایک اور جرم یاد دلایا۔

''اپنی فیکٹری کے ساتھ ساتھ تمہاری فیکٹری بھی تو لک آفٹر کر رہا تھا اس لیے دیر ہو جاتی تھی۔'' انہوں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور آپ نے مجھے وش تک نہیں کیا۔'' ایک اور فرد جرم عائد کی گئی تو وہ شوخ و شریر لہجے میں بولے۔

''میں اگر تمہیں وش کرتا تو صرف وش نہیں کرتا بلکہ تمہاری کامیابی میرے لیے ہمیشہ بہت خوشی کا باعث رہی ہے اس روز بھی میں بہت خوش تھا اور میں اس خوشی کو تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا مگر؟'' وہ شرارت سے بولتے پھر سے اس کے قریب چلے آئے۔ وہ جو ان کے لمس کو ترس رہی تھی اب ان کی قربت میں جل رہی تھی ان کے چھونے سے اس کا نازک بدن مہک رہا تھا اسے ان کی ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں تھیں۔

''وہ نیکلس تم نے میرے لیے خریدے تھے؟'' انہوں نے یاد آنے پر پوچھا۔

''جی نہیں آپ کے فرشتوں کے لیے خریدے تھے۔'' اس نے چڑ کر کہا تو وہ بے اختیار ہنس پڑے۔

''شکریہ گڑیا جس لڑکی کو میرے فرشتوں کا اتنا خیال ہے اسے میرا کتنا خیال

ہوگا یاد کی تھی آئی ایم۔''

''آپ نے کیا سمجھا تھا میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو شوہر کی موجودگی میں اس کے کزن سے...... آپ بہت برے ہیں آپ نے مجھ پر شک کیا۔'' وہ ان کے سینے پر مکے مارتے ہوئے کل والی بات یاد کرتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں بولی۔

''گڑیا شک نہیں تھا وہ غلط فہمی تھی۔ آئی ایم رئیلی سوری میں تو تمہاری خوشی کے لیے۔''

''میری خوشی کیا نہیں جانتے تھے آپ۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر روتے ہوئے بولی۔

''آپ نے ایسا کہا بھی کیوں آپ مجھے نہیں جانتے تھے یا اپنے کزن کو نہیں جانتے تھے۔ میں نے عمیر بھائی کو دل سے اپنا بھائی سمجھا میں نے تو ان کے لیے کوئی گفٹ بھی نہیں خریدا کہ آپ سے پوچھا نہیں تھا اور آپ نے خود تو مجھ سے بات کرنے کے روادار نہیں تھے میں نے عمیر بھائی سے دوستی کر لی تو آپ نے یہ رنگ دے دیا میری پاکیزہ دوستی کو آپ نے کیوں کیا ایسا کیوں؟''

وہ ان کے سینے اور بازوؤں پر مکے برساتی روتی جرح کرتی انہیں بالکل چھوٹی سی بچی دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا وہ نرمی سے اسے سمجھانے لگے۔

''گڑیا میری اجالا میں نے شک نہیں کیا تھا بیوقوف لڑکی میں تو یہ سمجھتا رہا کہ جس طرح میں تمہیں یکدم سے بیوی کے روپ میں قبول نہیں کر پا رہا اسی طرح تم بھی مجھے شوہر کے روپ میں قبول نہیں کر سکی ہو اور مجھ سے زیادہ یہ رشتہ تمہارے لیے پریشانی کا باعث بنا ہو گا۔''

''آپ کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوں نا تو چھوڑیں مجھے میں جا رہی ہوں یہاں سے''۔ اس نے ان کے مضبوط بازوؤں کا حصار توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا تو وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز لہجے میں بولے۔

''یہاں سے کہاں جاؤ گی تم ہوں میں بھلا تمہیں کہیں جانے دوں گا۔''

"چھوڑیں مجھے کالج جانا ہے۔" وہ ان کے انداز میں ٹپٹاتے ہوئے اپنی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"جھوٹی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اس کے بالوں میں لگا ایئر بینڈ کھینچ دیا اس کے سارے بال آزاد ہو کر اس کے شانوں اور چہرے پر بکھر گئے۔

"کیا ہے؟" وہ بچوں کی طرح چڑ کر بولی انہیں ہنسی آ گئی۔

"تم کالج جانے کے بہانے مجھے چھوڑ کر جا رہی تھیں شہاب والا کتنی خاموشی سے میری موت کا سامان کر رہی تھیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر تڑپ کر بولی۔

"کم از کم میری زندگی میں تو آپ کو کچھ نہ ہو۔"

"کچھ نہیں ہوگا مجھے۔" وہ محبت سے ان کا بھیگا چہرہ اس کے آنچل سے صاف کرتے ہوئے پیار سے بولے۔

"اجالا مائی سویٹ ہارٹ میں نے اس رشتے سے پہلے تمہیں بے پناہ چاہا ہے تم مجھے بہت عزیز بہت پیاری رہی ہو۔ میں تم سے بہت شدید محبت کرتا تھا تب بھی اور اللہ جانتا ہے کہ ان سارے برسوں میں محبتوں کے ان والہانہ لمحوں میں میرے دل و دماغ میں کبھی کوئی ایسی غلط سوچ آئی ہی نہیں تھی۔ میں نے تو کبھی بھولے سے بھی تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم سے میری شادی ہوگی۔ میں تو خود تمہارے لیے کوئی بہت مخلص اور محبت کرنے والا ہمسفر ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ قسمت مجھے ہی تمہاری زندگی کا ساتھی بنا دے گی گڑیا یہ تو قسمت کی بات ہے تقدیر کے فیصلے کے سامنے کسی کی نہیں چلتی یونہی تو نہیں کہتے نا کے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں تمہارا اور میرا جوڑا بھی روز ازل سے قسمت کی کتاب میں لکھا تھا تمہیں میرا بننا تھا اس طرح سے۔"

کتنے پیار سے وہ اسے سمجھا رہے تھے وہ ان کی باتوں کی سچائی سے دل کی گہرائیوں تک سے سرشار و شاداں ہوگئی اور انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے آپ پر غصہ آتا تھا کہ آپ نے مجھے مما پاپا کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا تھا چلی جاتی تو۔"

"تو میں ابھی تک کنوارہ ہوتا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر شوخی سے بولے تو اسے ہنسی آ گئی۔

"تمہارا مقدر تو میرے ساتھ لکھا تھا پھر بھلا میں تمہیں تمہارے مما پاپا کے ساتھ کیسے جانے دیتا اور میں جانے بھی نہیں دوں گا اجالا کو اپنی زندگی سے کیونکہ مجھے اجالا اچھا لگتا ہے اندھیرا نہیں۔ رات جب میں نے تمہارے جانے کے بعد اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے تمہاری محبت کے سوائے تمہاری چاہ کے، میں تمہیں پلکوں کی رحل پر تمام عمر رکھ کر پڑھنے کا متمنی نکلا تمہاری ان خوبصورت شربتی آنکھوں میں چاند بن کر طلوع ہونے کی آرزو میں بے چین، کروڑوں لمحوں میں وہ ایک لمحہ بھاری تھا جب مجھے ادراک ہوا کہ تم میری رگ رگ میں میری نس نس میں بسی ہوئی ہو۔ اس رشتے نے تو تمہیں میرے اور بھی قریب کر دیا ہے ابھی بھی بھولے سے بھی دور مت ہونا۔"

"کیوں.....؟" وہ ان کی محبتوں میں سرشار لہجے میں انہیں ستانے کو رخ پھیر کر بولی۔
وہ بھی اس کی شرارت سمجھ گئے تھے۔ ہنسی اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے پیار سے بولا۔

"چلو اب معاف بھی کر دو میرے بڑے ہونے کا نہ سہی شوہر ہونے کا ہی خیال کر لو۔"

"آپ نے تو میرے بیوی ہونے کا خیال کیا تھا؟" اس نے ایک اور نکتہ نکالا۔

"اب کروں گا نا خیال بہت زیادہ خیال رکھوں گا اتنا کہ تم تنگ آ جاؤ گی۔"
وہ اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر محبت سے بولے۔

"جی نہیں۔" وہ شرمیلی مسکان لبوں پر سجا کر بڑی ادا سے بولی۔

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

ذیشان نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سحر انگیز لہجے میں شعر پڑھا تو وہ شرما کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ذیشان کی روح خوشی سے جھوم اٹھی۔

"اب تو کوئی شکوہ، گلہ اور خفگی نہیں ہے نا"۔ انہوں نے مدھم لہجے میں پوچھا تو اس نے شرمیلے پن سے مسکاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مائی ڈیئر اینڈ ڈارلنگ اجالا تم سے محبت میں نے جو کی ہے وہ کوئی نہیں سکتا۔''انہوں نے شاعرانہ انداز میں اپنے جذبوں کا اظہار کیا۔

''میں کر سکتی ہوں۔''وہ بڑی ادا سے بولی۔

''اچھا تو کرو۔''وہ بہت شریر لہجے میں مسکراتے ہوئے بولے تو ہنس پڑی۔

''ہاں یاد آیا آج تو تمہاری سالگرہ ہے اٹھارہ برس کی ہوگئی ہے میری گڑیا اجالا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' ذیشان نے اچانک یاد آنے پر اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یاد تھی میری سالگرہ۔''وہ خوشی سے تمتماتے چہرے کو جھکا کر بولی۔

''یاد کیسے نہ رہتی پہلے کبھی بھولی ہے جو اب بھول جاتا بتاؤ کیا تحفہ لوگی؟'' انہوں نے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ کر پیار سے پوچھا تو اس نے شرماتے ہوئے ان کے شانے سے سر ٹکا کر آہستہ سے کہا۔

''اب کوئی اور تحفہ نہیں چاہیے''۔

''خوش رہو میری زندگی تمہاری یہ بے لوث اور بے غرض محبت ہی تو میرا سرمایہ ہے ویسے میں نے تمہارے لیے نیکلس خرید رکھے ہیں امتحان میں ٹاپ کرنے کا گفٹ بھی اور سالگرہ کا گفٹ بھی۔''انہوں نے اس کے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''اور شادی کا گفٹ؟''اس نے سر اٹھا کر انہیں پیار سے دیکھا۔

''وہ تو ابھی لے لینا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنا دولہا پسند آیا کہ نہیں۔''

''نہیں۔''وہ شرمائی۔

''کیوں؟''وہ اس کی شرارت سمجھ گئے تھے اس لیے سوال کیا

''کیونکہ جس سے بے حد و بے حساب، بے کراں، بے پناہ پیار ہو اس کے لیے پسند کا لفظ تو بہت چھوٹا اور بے معنی سا لگتا ہے۔''اس نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ان کے وجیہہ چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مدھم اور شرمگیں لہجے میں کہا۔

''آں ہاں سچ کہا تم نے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم مجھ سے بے پناہ پیار کرتی ہو اپنے شوہر ذیشان احمد سے جو تمہاری شیرینی لب، خوشبوئے دہن، شادابی دل، وارفتہ نظر پر جاں نثار کرتا ہے جس کے نام کی تمہارے ہاتھ پہ تابش حنا اب تک ہے تو گم ہی ہو گیا ہوں تمہاری آنکھوں کے یاقوت ہونٹوں کے مرجان اور ہاتھوں کی بے کل چاندی میں۔ تمہارے سرخ پھول سے دہکتے ہوئے رخسار کے خم میں اور اس کا کل کی شکن میں۔'' ذیشان نے اس کی زلفوں کو سنوارتے ہوئے اس پر والہانہ انداز میں نثار ہوتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تو اجالا بری طرح سٹپٹا گئی۔ اس رشتے سے بھی وہ اسے اس قدر شدتوں سے چاہیں گے کہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا اس کے دل سے دو ماہ کی بے رخی کے سارے ملال دھل گئے تھے۔ روح میں پھول کھل گئے تھے اس کے ذیشان، شانی جو اسے مل گئے تھے۔

''ذیشان۔''اس نے محبت سے بھیگتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''ذیشان نہیں صرف شانی تمہارا شانی۔''انہوں نے پیار سے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھر کر کہا تو وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''آپ تو شاعر بن گئے ہیں۔''

''شاعر نہیں شوہر۔''انہوں نے تصحیح کی تو وہ خوشدلی سے ہنس پڑی۔

''شانی۔''اس نے بہت والہانہ پن اور محبت بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی۔ محبت کے اظہار کا یہ انداز ذیشان کو روح تک سے سرشار اور سیراب کر گیا۔ الوہی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر سج گئی۔

محبت رنگ بدلتی ہے
نئے سانچے میں ڈھلتی ہے
کوئی بھی نام دو اس کو
دلوں سے کب نکلتی ہے
محبت تو محبت ہے
دلوں سے کب نکلتی ہے
فقط یہ رنگ بدلتی ہے
محبت رنگ بدلتی ہے

گونسلہ

اری باز آ جا نہ توڑ ان کا گھونسلہ تنکا تنکا کر کے تو انہوں نے یہ گھونسلہ بنایا تھا اور تو ڈنڈا لے کے توڑنے کھڑی ہوگئی چل ہٹ یہاں سے۔

دادی نے اپنی بیس سالہ پوتی کو آنگن میں لگے پیڑ کی شاخوں میں بنے چڑیوں کے گھونسلے کو بانس سے توڑتے دیکھ کر کہا وہ پیڑ کے نیچے تخت پر بیٹھی اپنی دوسری پوتی نادیہ کے بال سنوار رہی تھیں۔

دادی یہ گھونسلے خالی پڑے ہیں کب سے چڑیاں نہیں رہتیں ان میں، نازیہ نے جواب دیا۔

تو کیا چڑیلیں رہتی ہیں۔ نادیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نہیں وہ تو اس پیڑ کے نیچے رہتی ہیں۔ نازیہ نے دادی اور بہن نادیہ کو دیکھ کر کہا۔

ہٹے گی اب تو مجھ سے چل رکھ یہ بانس ایک طرف۔ دادی نے لتاڑ کر کہا۔

گھونسلہ تو توڑ دوں دادی پھر رکھ دوں گی۔

باز آ جا نازی کیوں ان بے زبان پرندوں کی بد دعا لیتی ہے۔

بے زبان کہاں سے ہوگئیں یہ چڑیاں سارا دن تو یہ چوں چوں کرتی رہتی ہیں اپنی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں اپنی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہیں۔ نازیہ نے گھونسلہ توڑتے ہوئے کہا تو دادی نے فرش پر ٹوٹ کر گرے گھونسلے کو دکھ سے دیکھا۔

اور اپنی زبان میں یہ تجھے بد دعا بھی دیتی ہوں گی کیسے ان کے آشیانے کے تنکے بکھیر کے رکھ دیئے توڑ دیا گھونسلہ اس ظالم لڑکی نے اب وہ کہاں رہیں گی؟

''وہ کون؟'' پرندے اور کون۔

دادی پرندے تو اپنے پروں میں رہتے ہیں گھونسلہ تو ایک بہانہ ہے۔ نازیہ نے بے نیازی سے کہا تو دادی نے فکر مند ہو کر اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

اللہ سے ڈر نازیہ بھی تیرا گھونسلہ بھی بننا ہے کیوں ابھی سے اس کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہے۔

کچھ نہیں ہوگا دادی آپ خوامخواہ وہم نہ کیا کریں۔

اللہ کرے کہ ایسا کچھ نہ ہو یہ میرا وہم ہی ہو تو اچھا ہے بس اتنی سی بات تھی گر گیا گھونسلہ اب چڑیا نیا گھونسلہ بنا لے گی۔ نازیہ نے گھونسلہ مکمل گرانے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

ہاں اتنا آسان ہے نا نیا گھونسلہ بنانا ارے بنانے والے کے دل سے پوچھا اس نے کس شوق لگن، محنت اور محبت سے یہ گھونسلہ بنایا تھا جو تو نے ایک بانس مار کر گرا دیا اس کا ___ توڑ دیا تنکا تنکا کر دیا اسے بے گھر کر کے رکھ دیا اللہ کو تیرا ___ پسند نہیں آیا ہوگا اگر اس نے بھی اپنا ڈانڈا گھما دیا نا ___ گھونسلہ بھی بننے کے بعد یونہی ٹوٹ کر بکھر جائے گا میرا ___ منہ میں خاک اری توبہ کر اللہ سے معافی مانگ فوراً ___ نے وہم وخدشات میں گھر کر فکر مندی سے کہا۔

اللہ میاں معافی دے دیں اور چڑیا کا نیا گھونسلہ بنا دیں یہ گھونسلے جو میں نے توڑے ہیں یہ تو خالی تھے اللہ میاں۔ نازیہ نے فوراً آسمان کو تکتے ہوئے کہا۔

اللہ جانے خالی تھے کہ بھرے پرے تھے چڑیاں تو پیڑ پہ سارا دن چہچہاتی پھریں۔ دادی نے تاسف سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔

انیس احمد اور عالیہ بیگم کے چار بچے تھے دو بیٹے نفیس اور رئیس اور دو بیٹیاں نادیہ اور نازیہ بیٹے شادی شدہ تھے اور بچوں والے تھے نازیہ اور نادیہ نے بی اے کا امتحان دیا تھا اور اب ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں نادیہ کا رشتہ تو اس کے

ماموں کے بیٹے جمال سے طے پا گیا تھا اور نازیہ کو ایک شادی کی تقریب میں عمیر نے پسند کر لیا تھا عمیر ایک بزنس مین تھا بہت دولت مند تھا نازیہ کا معصوم حسن دیکھتے ہی وہ اس پر فدا ہو گیا تھا اور اپنا رشتہ بھیج دیا انیس احمد سرکاری ملازم تھے متوسط گھرانہ تھا ان کا عمیر کا رشتہ آنے پر ان سمیت سبھی بہت خوش تھے کہ اتنے بڑے گھر کی بہو بنے گی نازیہ سب اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے عمیر کی ایک بہن تھی جو شادی شدہ تھی اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اب وہ اکیلا تین کنال کوٹھی میں رہتا تھا تھوڑی بہت سوچ بچار کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا گیا بلقیس بیگم یعنی دادی چاہتی تھیں کہ خاندان میں ہی نازیہ کی شادی ہو مگر شاید نازیہ کی قسمت میں عمیر سے بیاہنا لکھا تھا سو انہوں نے بھی رضامندی دے دی بظاہر عمیر ___ کوئی برائی بھی نہیں تھی خوش شکل خوش لباس، خوش ___ خوشحال اور دولت سے مالا مال تھا تعلیم یافتہ تھا ___ یہ تو بہت خوش تھی اتنا خوبرو اور امیر جیون ساتھی اس کا ___ بن رہا تھا نازیہ جمال کی دلہن بن کر اس کے گھر ___ ہو گئی تھی اور نازیہ عمیر کے سنگ بڑی شان سے ___ ہو کر عمیر لاج آ گئی عمیر اسے پا کر اور وہ عمیر کو پا کر بہت خوش تھی۔ ہنی مون شمالی علاقہ جات کے علاوہ انگلینڈ میں منایا گیا۔ نازیہ تو پہلے سے زیادہ نکھر گئی تھی اس کے چہرے کی گلابیاں مزید گہری ہو گئی تھیں آنکھوں ___ اور لہجے کی کھنک میں مزید اضافہ ہو گیا تھا عمیر اور اس کے سامنے نت نئے فیشن کے قیمتی ملبوسات اور جیولری کا ڈھیر لگا دیا تھا وہ بجتی سنورتی دل لبھاتی اس کا دل و جان سے خیال رکھتی جو ایک مشرقی بیوی کے فرائض کا حصہ ہے عمیر کے دوستوں اور رشتے داروں کے ہاں دعوت میں بھی جاتی مگر بزنس ڈنر میں جانے سے اس نے انکار کر دیا تو عمیر نے اسے سمجھایا۔

نازی بزنس ڈنر میں بیگمات اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں۔

بزنس آپ مرد کرتے ہیں [illegible] میں بیویوں کو کیوں ساتھ گھسیٹا جاتا ہے مجھے اچھا نہیں لگتا غیر مردوں کے سامنے [illegible] سنور کر مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر باتیں کرنا۔ پچھلے ہفتے آپ نے گھر پر بزنس [illegible] دیا تھا آپ کے بزنس سرکل کے سارے مرد اتنی للچائی ہوئی نظروں سے دوسرو [illegible] بیویوں کو دیکھ رہے تھے کہ مجھے ان سے گھن آ رہی

تھی۔

تو تم ان نظروں کا مقابلہ کرنا سیکھو یوں گھر میں بند ہو کر کب تک بیٹھی رہو گی آخر میں نے تم سے شادی کی ہے بیوی ہو تم میری تم میرے ساتھ نہیں چلو گی تو کیا میں کسی اور کی بیوی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ عمیر نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

لیکن عمیر پلیز دیکھو نازی ہماری سوسائٹی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں انہیں بہرحال نبھانا پڑتا ہے دوسرے مرد بھی تو ہیں جن کی بیویاں ان کے شانہ بشانہ چلتی ہیں ان کے بزنس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہیں ایک تم ہو اکیسویں صدی میں رہتی ہو اور تمہارے انداز و اطوار انیسویں صدی کے ہیں آج تو اکیلا جا رہا ہوں بزنس ڈنر پر لیکن آئندہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ تم سے میں نے یونہی شادی نہیں کی کہ میں تمہارے ناز اٹھاتا رہوں اور تم میرے لیے ایک بزنس ڈنر تک اٹینڈ نہ کرو میرے سرکل میں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی تم سے شادی کی ہے تو اس کا کچھ سبب بھی ہو گا اچھی طرح سوچ سمجھو اور خود کو میری مرضی اور میرے ماحول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو۔ خدا حافظ۔

عمیر نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدہ سپاٹ اور معنی خیز لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا نازیہ کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں احساس ذلت نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا تو مسٹر عمیر آپ نے میرے حسن کو اپنے بزنس کی ترقی کا ذریعہ بنانے کے ارادے سے مجھ سے شادی کی تھی افسوس میں جسے پیار سمجھتی تھی وہ کاروبار نکلا جو کچھ عمیر صاحب آپ مجھ سے چاہتے ہیں وہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا میری حیاء وفا اور ادا شوہر کے لیے ہے اس کے بزنس فیلوز کے لیے نہیں ہے۔ وہ اسے دل میں مخاطب کر کے بولی اور وضو کر کے عشا کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔

اس روز بزنس ڈنر میں عمیر کی ملاقات مینا سے ہو گئی جو بہت بے باک تھی فیشن زدہ پر اعتماد اور ادائیں دکھا کر مقابل کو مدہوش کر دینے والی عمیر بھی اس کی اداؤں کے جال میں پھنس گیا اور چند روز بعد اسے لگا کر اسے اپنے بزنس کو بام عروج پر

انے کے لیے ٹینا جیسی سیڑھی کی ہی ضرورت ہے سواس نے ٹینا کو ایک کینڈل
ٹ ڈنر میں پرپوز کر دیا اور ٹینا نے بخوشی عمیر کے ہاتھ سے انگوٹھی پہن کر اس کے
پوزل کو قبول کر لیا کیوں کہ وہ خود بھی عمیر کو پسند کرنے لگی تھی اور اس کی دولت کے
ے لوٹنے کے خواب وہ بھی دیکھ رہی تھی۔

نازیہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔

کیا؟ ___ نازیہ عمیر کی بات سن کر شاک میں آتے ہوئے بولی۔ ''ہاں''

مگر مجھ میں کیا کمی ہے۔ تم میں عقل کی کمی ہے۔

اتنی جلدی دل بھر گیا آپ کا مجھ سے میں نے صرف آپ کے بزنس فیلوز سے
ملنے سے انکار کیا ہے اور کون سی بات ہے جو میں نے نہیں مانی آپ نے کہا کہ آپ کو
تنی جلدی بچے نہیں چاہیں تو میں نے بچوں کے لیے ضد نہیں کی آپ نے میرا میکے جانا
کم کرا دیا میں نے اس پر احتجاج نہیں کیا پھر بھی آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں
آپ تو میرے حسن کے قصیدے پڑھتے تھے۔ وہ تڑپ کر روہانسی ہو کر بولی۔

ہاں یہ تو میں اب بھی کہتا ہوں کہ تم بہت حسین ہو مگر تمہارے حسن کا میرے
بزنس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تم مشرقی روایات کی حیا کا آنچل اوڑھ کر دقیانوسی
سوچ کی مالک بن کر گھر میں رہ کر شوہر کی خدمت گزار بیوی بن کر رہنا چاہتی ہو جبکہ
مجھے لائف پاٹنر ہی نہیں بزنس پاٹنر بیوی چاہیے میری خدمت کرنے کے لیے گھر میں
ملازم موجود ہیں مجھے ایسی بیوی چاہیے جو میرے کاروبار میں اپنا حصہ ڈال سکے اور
ٹینا ایسی لڑکی ہے وہ جانتی ہے کہ کس طرح ڈیل کرنا ہے وہ الٹرا ماڈرن اور بولڈ لڑکی
ہے پر اعتماد اور ذہین ہے بزنس کے طور طریقے سمجھتی ہے اسی لیے میں اس سے شادی
کر رہا ہوں۔

اور میں ___ میں کیا کروں گی؟ نازیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں تمہیں اپنی قیدی بنا کر نہیں رکھوں گا۔ تمہیں آزاد کر دوں گا تم اپنی طرح کے
کسی ہم مزاج ہم خیال شخص سے شادی کر لینا کسی ایسے شخص سے جو تمہاری شوہر پرستی
وفاداری کا مان بن سکے تمہاری وفا شعاری کی لاج و حیا اور خدمت گزاری کی قدر

کر سکے اس سے خوش ہو سکے مجھے افسوس ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی تمہیں اپنے
ساتھ نہیں رکھ سکتا ایک تو ٹینا ایسا نہیں چاہتی دوسرے تم ناحق اکیلی جلتی کڑھتی رہو گی
کیا فائدہ اور نازی ڈیئر کاروبار میں پیار کی جگہ نہیں ہوتی اور زندگی میں آگے بڑھنے
کے لیے ترقی کرنے کے لیے پیار کی نہیں تعلقات عامہ کی ضرورت اور اہمیت ہوتی
ہے اور ٹینا کی رسائی بہت آگے تک اور زبردست ہے لہٰذا اس کی اسی خوبی کی وجہ
سے اس سے بھی پیار ہو ہی جائے گا تم اپنے لیے کوئی نیا ساتھی ڈھونڈ لینا جو تمہیں پیار
دے سکے نیا گھر دے سکے۔ عمیر نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کے دل کا خون کیا۔

نیا ساتھی ___ نیا گھر ___ نیا گھونسلہ ___ وہ زیر لب بڑبڑائی اس
کے کانوں میں وادی کی آواز بازگشت ___ دی۔

''ہاں اتنا آسان ہے نا نیا گھونسلہ بنانا ارے بنانے کے دل سے پوچھا اس
نے کس شوق، لگن، محنت اور ___ سے یہ گھونسلہ بنایا تھا'' ۔ ہاں تم نیا گھر بنا لینا۔ عمیر
___ بے نیازی سے کہا۔ ''کیا نیا گھر بنا لینا اتنا ہی آسان تھا جتنا آپ سمجھ رہے
ہیں؟''

میرے لیے تو ہے۔ عمیر نے کندھے اچکا کر کہا۔

آپ مرد جو ٹھہرے ہر چیز پر اختیار ہے آپ کا اور میں ___ بے زبان چڑیا کی
طرح ہوں جو اپنا گھونسلہ ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر ''چوں'' بھی نہیں کر سکتی خیر آپ کو اپنا
نیا جیون ساتھی اور پرانا گھر مبارک ہو وہ دلگیر لہجے میں بولی۔

یہ تمہارا طلاق نامہ ہے بمعہ حق مہر۔ عمیر نے کوٹ کی جیب میں سے ایک لفافہ
نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چکرا گئی۔

بہت جلدی کی آپ نے اتنی جلدی تو پرندے بھی اپنے گھونسلے نہیں چھوڑتے
جتنی جلدی آپ نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا آپ کا بھی کوئی قصور نہیں قصور تو میرے
بخت کا ہے جو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا کسی معصوم بے زبان چڑیا کا
گھونسلہ گرا کر۔ نازیہ طلاق نامہ ہاتھ میں پکڑے بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھتے
ہوئے بولی اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے اس چڑیا کی بددعا لگی ہے جس کا گھونسلہ اس

نے ڈنڈا مار کر پیڑ سے نیچے گرادیا تھا جبھی تو اس کی سزا کے طور پر اللہ میاں نے اس کا
گھر گھونسلہ بھی توڑ دیا ہے۔

میں ایک ہفتے کے لیے لندن جارہا ہوں واپسی پر ٹینا سے شادی کرلوں گا تم اس
گھر سے جو کچھ بھی لے جانا چاہو لے جاسکتی ہو اپنی گاڑی بھی لے جاسکتی ہو لیکن
اپنے لیے ایک وفادار شوفر یعنی شوہر ضرور ڈھونڈ لینا۔ ہائے نازی گڈ بائے۔ عمیر نے
مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ اپنا بچا کچا
سامان سمیٹ کر میکے آ گئی۔ دادی آپ نے سچ کہا تھا مجھے چڑیا کی بددعا لگ سکتی ہے
مجھے ان معصوم بے زبان چڑیوں کی بددعا لگی ہے دادی جن کا میں نے گھونسلہ گرایا تھا
جن کا آشیانہ توڑ دیا تھا دیکھیں دادی میرا آشیانہ بھی تنکا تنکا بکھر گیا ٹوٹ گیا ہے میرا
گھونسلہ اب میں کہاں رہوں گی دادی؟ میرے تو پر بھی نہیں ہیں دادی۔ وہ روتے
ہوئے دادی سے سوال کر رہی تھی بوڑھی دادی نے تڑپ کر اسے اپنی بوڑھی اور
کمزور بانہوں کے پروں میں چھپالیا وہ ان کی آغوش میں چھپ کر تڑپ تڑپ کر رو
دی دادی کی اشکبار نگاہیں آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں؟ اس کا
گھونسلہ یا حوصلہ؟

☆☆☆

یہ ہم لڑکیاں

پیاری دوست مسرت!

اپنے نام کی طرح پر مسرت اور راحت بخش زندگی بسر کرو۔ تمہارا بھیجا ہوا برتھ
ڈے گفٹ مجھے مل گیا ہے۔ اتنا قیمتی تحفہ اس رسٹ واچ کی ٹک ٹک تمہاری محبت کی
مہک بن کر تمہارے خلوص کی آواز بن کر ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتی رہے گی۔
تمہارا بھیجا ہوا تحفہ پا کر مجھے دلی مسرت ہوئی مگر جب گھر والوں سے ڈانٹ پڑی تو
خوشی جاتی رہی۔ تمہیں میں نے ہزار ہا منع کیا ہے کہ مجھے تحفے مت بھیجا کرو مگر تم تو
اپنی ساری جمع پونجی مجھ پر ہی خرچ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ اب تمہاری محبتوں کے تحفوں
پر مجھے گھر والوں سے خوب ڈانٹ پڑتی ہے۔ پچھلی بار تم نے انگوٹھی اور گلاب کے
پھولوں کا گلدستہ بھیجا تھا تو مجھ پر یہ الزام لگادیا گیا کہ یہ تحائف مجھے لڑکی نے نہیں بلکہ
کسی لڑکے نے بھیجے ہیں۔ اب تم خود ہی سوچو کہ جہاں والدین کے اعتبار کا یہ
عالم ہو وہاں مجھ جیسی لڑکی کس طرح کسی سے دوستی نبھا سکتی ہے۔ کس طرح زندگی کے
میدان میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ میرے گھر والے اعلیٰ تعلیم یافتہ تو ہیں مگر وہ اعلیٰ
درجے کے ماہر ہیں اپنے اس ہنر کو چھپانے میں ہم تو بے اعتباری کے اعلیٰ عہدوں پر
فائز ہو چکے ہیں کیا انگوٹھی اور گلاب صرف ایک مرد کی ہی محبت اور دوستی کی علامت
ہوتا ہے؟ کیا ہم لڑکیاں ایک دوسرے کو انگوٹھی اور سرخ گلابوں کے تحفے نہیں بھیج
سکتیں؟

تمہارا خلوص، تمہارا اعتبار اور قرار اپنی جگہ مگر دوست اس کے بدلے میں مجھے

جو کچھ سنا اور سہنا پڑتا ہے اس کا انداز بھی کبھی لگانے کی کوشش کی تم نے؟ اور جذباتی لڑکی! اب ایک ماہ پہلے تمہاری شادی ہوگئی ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے اب بھی کوئی تحفہ مت بھیجنا، تمہارا خلوص اور تمہاری دعاؤں کا تحفہ ہی میرے لیے بہت اہم اور قیمتی ہے۔ اب تم شوہر کے گھر میں ہو بچت کی عادت اپناؤ اور بے شک مجھے بھول جاؤ تم اگر اپنے شوہر کی اجازت سے آسانی اور سہولت سے مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو تو ٹھیک ہے رابطہ رکھنا ورنہ دلوں اور دعاؤں کا رابطہ ہی ہمیں ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے کو کافی ہے۔

مسرت ڈیئر! نصاب زیست میں کچھ مضامین لازمی ہوتے ہیں اور کچھ مضامین اختیاری ہوتے ہیں اور کچھ مضامین اختیاری ہوتے ہیں۔ جنہیں بہ وقت ضرورت چھوڑنا پڑتا ہے۔ تمہاری میری دوستی بھی ایک اختیاری مضمون ہے اور تمہارے میکے اور سسرال کے رشتے شوہر کا رشتہ لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور لازمی مضمون میں پاس ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا زندگی کے کسی موڑ پر اگر کبھی تمہارے پاس اس اختیاری مضمون کو پڑھتے وقت دینے میں مشکل درپیش ہو جائے تو بے شک کرن نامی، اس مضمون کو تم اپنی زندگی کے نصاب سے خارج کر دینا۔ ہاں لیکن مجھے بتا ضرور دینا تاکہ مجھے تمہارے فون یا خط کا انتظار نہ رہے۔ میں بھی جب تک حالات سازگار رہیں گے تم سے رابطہ رکھوں گی۔ انشاء اللہ تمہارے لیے ایک پر مسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی خواہش مند دعا گو تمہاری دوست۔

کرن کی مانند جگمگاتے چہرے والی میری عزیز از جان دوست کرن!

تمہارا خط محبت، نصیحت، راحت کے ساتھ ساتھ دکھ اور آنسو لے کر آیا۔ چلو مانا کہ اب میں میکے والی نہیں میاں والی ہوگئی ہوں تم کہتی ہو تو اب تمہیں گفٹ بھی نہیں بھیجوں گی۔ صرف تمہارے گھر والوں کی تنگ نظری اور شکی طبیعت کی وجہ سے تمہیں میری وجہ سے آج تک کتنی بار ڈانٹ کھانی پڑی پلیز مجھے معاف کر دینا۔ مگر میں کیا کروں تم مجھے بہت زیادہ سے زیادہ اچھی لگتی ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں

تمہیں ساری دنیا کے خزانے دے دوں۔ لیکن میرے اختیار میں جو ہے وہی دے سکتی ہوں ناں۔ دعاؤں میں تو تم ہمیشہ شامل رہو گی۔ تمہیں میں کتنا چاہتی ہوں شاید تم بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ تم سے باتیں کرنے کو تم سے ملنے کو بہت دل مچلتا ہے کیا کروں دل تو پاگل ہے۔ تمہاری دعاؤں سے میں شادی کے بعد بہت خوش ہوں۔ زاہد بہت اچھے شوہر ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے بہت چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں تمہاری اور میری دوستی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ میں تمہیں خط لکھ سکتی ہوں۔ فون کر سکتی ہوں۔ اور تم بھی کرن کتاب، میرے نصاب زیست سے کبھی خارج ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا میکہ قریب ہے اور آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ساس بھی سمجھو دوست ہی ہیں۔ سب بہت اچھے ہیں۔ میں بہت زیادہ خوش ہوں۔

تم نے شادی پر جو تحائف بھیجے تھے وہ سب کو بہت پسند آئے۔ انہیں دیکھتی ہوں تو تم بہت یاد آتی۔ کاش تمہارا اور میرا گھر آمنے سامنے ہوتا پھر تو ہم روز ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ملتے ملاتے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی بہت مخلص اور محبت کرنے والا جیون ساتھی عطا فرمائے۔

اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ سارے گھر کی ذمہ داری سنبھالتے تم اپنی صحت سے غافل ہوگئی ہو۔ گھر میں سب کو سلام کہنا۔ خط کا جواب جلدی دیا کرو۔ مجھے شدت سے انتظار رہتا ہے۔ تمہاری محبت کا خانہ دل میں الگ ہے اور اس خانے میں کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا (وہ بھی نہیں) تمہاری مسکراتی صورت میری نگاہوں میں ہے۔ کاش تم بھی اس وقت میرے سامنے ہوتی۔

میری بہنیں تو میرا مذاق اڑاتی ہیں کہ کرن تمہاری گرل فرینڈ نہیں بوائے فرینڈ لگتی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ لڑکا لڑکی ہی ایک دوسرے کو شدت سے چاہیں۔ لڑکیاں بھی تو ایک دوسرے کو شدت سے چاہ سکتی ہیں۔ ہماری طرح رابطہ ٹوٹنے کا ذکر مت کرنا میرا دل ٹوٹنے لگتا ہے۔

اچھا اب اجازت دو خط خاصا طویل ہوگیا ہے اور ان کے گھر آنے کا وقت بھی

ہو گیا ہے ان کے لیے تیار بھی تو ہونا ہے تمہارے قیمتی مشوروں پر عمل کر رہی ہوں پہلے بھی کرتی رہی تھی تم بہت سمجھدار دوست ہو میری۔ والسلام تمہاری دوست۔

پیاری دوست مسرت!

کہاں ہو بھئی یہ میرا تیسرا خط ہے اور تمہاری جانب سے کوئی جواب ہی موصول نہیں ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ لگتا ہے کہ گھر کی ذمہ داریاں اب پوری طرح تمہیں اپنی گرفت میں لے چکی ہیں اور تمہارے پاس میرے خط کا جواب دینے کا بھی وقت نہیں ہے۔ بہر حال مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے جب نئے رشتے بنتے ہیں تو نئی ذمہ داریاں بھی نبھانا پڑتی ہیں اور جب ذمہ داریاں سر پر پڑتی ہیں تو یاریاں بھول جاتی ہیں۔ تمہارے میکے کا کیا حال ہے یقیناً وہاں بھی خیریت ہوگی اور سنو میکے روز روز مت جایا کرو سسرال والے لاکھ اچھے ہوں کبھی نہ کبھی برا مان ہی جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ناں قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی تم تو قابل قدر رہتی ہو۔ اب جلدی سے اٹھو خط کا جواب لکھو فوراً میں منتظر ہوں بے شک اپنی خیریت کے دو جملے ہی لکھ دو۔ والسلام تمہاری دوست۔

عزیز از جان دوست کرن!

خوش رہو۔ تمہارے خط مجھے مل گئے۔ تم نے درست سمجھا کہ میں گھر داری میں مصروف ہو کر تمہیں خط نہیں لکھ سکی اور یہ بھی بجا کہ ذمہ داریاں، یاریاں، بھلا دیتی ہے۔ مگر تم بھلائے جانے والی ہستی نہیں ہو۔ تم ہر وقت ہر لمحہ مجھے یاد رہتی ہو۔ بس وقت ہی نہیں ملتا کہ محبت کا اظہار ٹیلی فون یا خط کے ذریعے کر سکوں۔ میں شہر میں ہوتے ہوئے بھی تم سے ملنے نہیں آ سکتی۔ تمہیں مہینے میں ایک بار فون کرتی ہوں تو سارا مہینے بھر کا بل میرے کھاتے میں آ جاتا ہے۔

ارے تم حیران اور پریشان ہو رہی ہو۔ ہاں تم ٹھیک سمجھی ہو تمہارا خدشہ درست

ہے تم شادی کے متعلق صحیح کہا کرتی تھیں کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات شادی سے ملنے والی خوشیوں کے سائیڈ ایفیکٹس مجھ پر بھی ظاہر ہونے لگے ہیں۔ ہنی مون پریڈ ختم ہو گیا۔ منی فون پیریڈ شروع ہو گیا۔ تمہاری بتائی ہوئی سمجھائی ہوئی بہت سی باتیں میرے کام آئیں اور آ رہی ہیں۔ تم نے صحیح لکھا تھا کہ میکے روز روز نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں کل ہی میکے گئی تھی اور دل پر زخم لے کر لوٹی ہوں۔ بڑے بھیا کہنے لگے۔

''مسرت! کو تو ہم نے بیاہ دیا تھا مگر فائدہ کوئی نہیں ہوا یہ تو ہر روز ہمارے سر پر سوار رہتی ہے۔ گھر میں کوئی کام نہیں ہے اسے''۔

یہی بڑے بھیا پہلے کہا کرتے تھے کہ ''شکر ہے مسرت کا سسرال قریب ہی ہے جب دل چاہے گا یہ یہاں آ جایا کرے گی اور ہم اس سے ملنے چلے جایا کریں گے''۔ اب انہیں کا لہجہ طنزیہ اور کاٹ دار ہو گیا ہے شاید بھابی نے بھی انہیں بھڑکایا ہو گا کیونکہ وہ تو مجھے دیکھتے ہی بڑبڑائی تھیں۔

''لو پھر آ گئی''۔ اور تو اور کرن! امی تک نے کل مجھے دیکھتے ہی میرے سلام کا جواب دینے کی بجائے کہا تو یہ کہ ''مسرت! یہ کیا وطیرہ بنا رکھا ہے تم نے جب دیکھو میکے میں آتی ہو گھر میں دل نہیں لگتا تمہارا اب شوہر کا گھر ہی تمہارا گھر ہے اپنے لیے اس گھر میں مصروفیت پیدا کرو''۔

اور کرن میرا دل ڈوب گیا نجانے بند کیوں نہیں ہو گیا امی کا رویہ لہجہ اور انداز ایک دم ہی بدل گیا تھا۔ میں تو سارا کام نبٹا کر ہی میکے کا رخ کرتی تھی۔ سو جب اسی وقت واپس سسرال پہنچی تو میری ساس جو آج کل روایتی ساس کا عکس دکھانا شروع ہو گئی ہیں وہ میرے شوہر سے کہہ رہی تھیں (جو جانے کل وقت سے پہلے گھر کیسے آ گئے تھے۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں میں کہیں نہیں جاتی میکے بھی ان کے ساتھ جاتی ہوں یہ بھی تمہارا ہی مشورہ تھا)

''بہو رانی کا تو گھر میں دل ہی نہیں لگتا۔ جب جی چاہا بن سنور کر منہ اٹھایا اور میکے چل دیں۔ ارے مجھے پتہ ہوتا کہ ان کے یہ لچھن ہوں گے تو میں کسی دور پرے

علاقے میں تیرا بیاہ کرتی سال سے پہلے تو میکے جانے نہ دیتی۔ مگر میری قسمت یہاں تو میکہ قریب کیا ہوا بس ابھی تک میکہ ہی سب کچھ ہے۔ نامعلوم کیا کشش ہے میکے میں جو بہورانی دوڑ دوڑ کر میکے جاتی ہیں"۔

کرن! میں ایک ہی دن میں مسمار ہوگئی۔ میرا فخر ٹوٹ گیا۔ یہ بھی شکر ہے کہ میرے شوہر دل کے اچھے ہیں۔ میری نند بھی آتی رہتی ہے۔ زاہد نے اسی کا ذکر کیا تو میری ساس خاموش ہوگئیں۔ میکے میں کیا کشش ہوتی ہے کیا وہ نہیں جانتیں وہ بھی تو کبھی کسی گھر کی بہو بھی کر آئیں تھیں۔ وہ تو خود بتاتی ہیں کہ زاہد کی پیدائش پر پورے چھ مہینے میکے گزار کر آئیں اور اب اللہ کے فضل و کرم اور تمہاری دعاؤں سے میری گود میں بھی پھول کھلنے والا ہے۔ میری ساس نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں نے تو اپنے بچوں کا بھی کام نہ کیا تمہارا کیسے کروں گی میکے چلی جانا۔ کیا دوغلا پن ہے۔ کتنے دوہرے معیار زندگی میں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں میکے اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک میری ساس اور شوہر دل سے مجھے میکے جانے کی اجازت نہیں دیں گے اور جب تک امی کی طرف سے میکے آنے کا اصرار نہیں ہوگا۔ کیا فائدہ جانے کا کہ نہ کوئی دل سے بھیجے نہ کوئی دل سے دیکھے۔

خوشی کی جگہ بیزاری ہونے لگے تو کیا کرنا جا کر۔ یہ رشتے تو خوشی سے مضبوط ہوتے ہیں لیکن پتہ نہیں آج کل ان مقدس رشتوں کو کبھی کیا ہوتا جارہا ہے۔ بوجھ، اذیت، بیزاری، جان کا وبال بجھنے لگے ہیں سب۔ کتنا مشکل ہوتا ہے۔ منافقت کے ساتھ زندہ رہنا مگر رہنا پڑتا ہے کیونکہ سانسوں کا [illegible]لے جانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔

میں نے تمہیں بھی دکھ[illegible]س سے کہتی یہ ساری باتیں اب میں نے فون نہ کرنے، خط نہ لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم برا مت ماننا میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ سارے راستے بند کر کے انسان سانس کیسے لے سکتا ہے۔ ہوا کہاں سے حاصل کرتا ہے۔ آکسیجن کیسے اس کے پھیپھڑوں تک پہنچتی ہے۔ قسمت میں ہوا تو بات اور ملاقات ہو جائے گی ورنہ بقول تمہارے دل کا رابطہ تو ہمیشہ رہے گا دعا کا تعلق تو ہمیشہ

رہنے والا ہے۔

یہ خط بھی پڑھ کر جلا دینا۔ بلکہ میرے سارے خط جلا دینا۔ ورنہ پڑھ پڑھ کر اپنا آپ جلاتی رہو گی۔ اپنا بہت خیال رکھنا مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا تم نے کہا تھا رابطہ ختم کرنے سے پہلے مجھے بتا دینا۔ اسی لیے بتا رہی ہوں میری ہر خطا معاف کر دینا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم ابھی شادی کے مرحلے سے نہیں گزریں پھر بھی تمہاری باتیں کتنی درست ثابت ہوئی ہیں۔ بقول تمہارے دوسروں کا تجربہ اپنا مشاہدہ اور مطالعہ بھی بہت کچھ سیکھا اور سمجھا دیتا ہے۔ خط بہت طویل ہوگیا ہے دکھ کے موسم اور ہجر کی سب کی طرح تمہارے لیے دل سے دعا گو رہنے والی۔ تمہاری دوست۔

پیاری دوست مسرت!

سدا صحت مند اور شاد رہو۔ تمہارا خط تھا کہ دکھ کا پروانہ، تم نے کہا کہ خط نہ [illegible]، خط کے پیچھے لکھ دیا کہ اس خط کا جواب ضرور دینا۔ اس کے بعد میرے خط کا انتظار مت کرنا نہ ہی مجھے خط لکھنا۔ اب کیا رہ گیا ہے لکھنے کو؟ اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا جو اجازت دل سے نہ ملی ہو وہ ہمیشہ دکھ دیتی ہے۔ تم بہت جذباتی، شدت پسند اور بہت حساس ہو اس لیے تمہیں ان حالات میں بہت تکلیف پہنچی ہوگی۔ دل کو مضبوط بناؤ۔ حوصلہ بلند کرو، ننھے مہمان کی آمد کی خبر بہت خوشگوار ہے بہت بہت مبارک ہو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

تمہارا لازمی مضمون تمہارے شوہر کا نام ہے مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ہم لڑکیاں، سہیلیاں افورڈ نہیں کرسکتیں۔ ہماری پہنچ صرف یادوں، باتوں اور دعاؤں تک محدود ہے۔ ہماری سوچوں میں خیالوں میں جو گھر بنتے ہیں وہ کتابوں میں ملتے ہیں حقیقت میں ان کا عکس ڈھونڈنے اور بتانے کے لیے ہمیں اپنا بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ پھر بھی ہماری کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ہم لڑکیاں وہ تتلیاں ہیں جو میکے کے چمن سے اڑ کر سسرال کے گلشن میں آجاتی ہیں اور اپنا رنگ روپ گلشن کو سونپ کر خود

بے رنگ ہو جاتی ہیں اور بے رنگ تتلیاں کب کسی کو بھاتی ہیں۔ تتلی اپنا رنگ صرف پھولوں کے قریب رہ کر حاصل کرسکتی ہیں۔ تم بھی کوشش کرتی رہنا کہ جو کانٹے تمہارے پھولوں کے قریب اگ رہے ہیں وہ ختم ہو جائیں اور تمہاری زندگی پر قوس وقزح کے رنگ چھا جائیں۔

شادی کے بعد لڑکی کو بہت کچھ بولنا، چھوڑنا اور بدلنا پڑتا ہے۔ تم بھی حالات کے مطابق خود کو ڈھال لو۔ تم نے صحیح لکھا کہ منافقت کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ عورت کی زندگی بھی کتنی عجیب ہے اوروں کے سکھ کی خاطر وہ کیا کیا جتن کرتی ہے؟ اور خود پھر بھی بے سکون ہے کبھی کسی نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ شادی کے بعد ہم لڑکیاں نہ ادھر کی رہتی ہیں نہ ادھر کی۔ میکے کی محبت خواب بن جاتی ہے۔ نہ میکہ اپنا رہتا ہے نہ سسرال اپنا بنتا ہے ہم لڑکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے خواب ختم ہو جاتے ہیں مگر ہمارے دکھ ختم نہیں ہوتے اور ہماری محرومیاں، حسرتیں بن کر آنے والیوں کی راہ میں کھڑی ہو جاتی ہیں پھر اسی کہانی کے آغاز کی خاطر آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟
شاید ہمیشہ تمہارے لیے ایک پرمسرت، پروقار اور پر بہار زندگی کے لیے دائم دعا گو۔

تمہاری دوست
کرن بختیار

......☆☆☆......

تیرے ہجر کی شام

''یہ کیا وہی گجرات ہے کاجل کی ماں جو میں چون برس پہلے چھوڑ گئی تھی۔ ارے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ نہ آسمان کا رنگ نہ لوگوں کا ڈھنگ، کیا پھر کوئی نئی تحریک اٹھنے کون ہے؟'' بی جان نے مسلم کش فسادات کی تازہ ترین صورتحال میں سوال کیا۔ تو نعمت خانے میں بیٹھی کاجل کی ماں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''تحریک تو اول دن سے ہی مسلمانوں کو کچلنے اور ختم کرنے کی رہی ہے۔ بی جان بھارت سرکار الیکشن میں ناکامی کا غصہ ہم مسلمانوں کو ختم کر کے اتار رہی ہے۔ ہندوؤں کو پاکستان سے تو خدا واسطے کا بھیر ہے۔ سیکولرازم کا ڈراما رچا رکھا ہے بھارت نے۔ بی جان ہم تو بس کلمے کے مسلمان ہیں۔ نہ مرد مسجد میں سجدہ ریز ہو سکتے ہیں نہ ہم اسلامی نام رکھ سکتے ہیں۔ اب کاجل کو دیکھ لیں اصلی نام زینب ہے پر ہندوؤں کے ڈر سے کاجل کہتے ہیں اور اس کا دولہا علمدار حسین ہے۔ کیسا پیارا نام ہے مگر ہم اسے چاند کہہ کے بلاتے ہیں اب سوچئے جہاں ہم اپنی مرضی سے بچوں کے نام نہیں پکار سکتے وہاں اور کیا کریں گے''۔

''یہ چاند آیا نہیں ابھی تک شام ڈھلنے کو ہے۔ حالات دن بدن بدتر ہوئے جا رہے ہیں اسے زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے اور ابھی تو اس کی شادی کو بھی سات دن ہی ہوئے ہیں اپنی دلہن کے ساتھ رہے''۔ بی جان نے کاجل کے گندمی رنگت والے دلکش چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو کاجل کے چہرے پر شرم اور خوف کا ملا جلا تاثر ابھر آیا۔

''بی جان مجھے خوف آتا ہے اگر اس آگ کا رخ ہمارے گھر کی طرف بھی ہو گیا تو کیا ہو گا؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''بیٹا یہ تو خدا ہی جانتا ہے میں تو خود یہاں آ کر پھنس گئی ہوں۔ کراچی میں سب مجھے روک رہے تھے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں مت جائیں بی جان۔ مگر میں نے ان کی بات پہ دھیان نہیں دیا۔ اب میری بہو جیسی سہیلی کی بیٹی نے مجھے اپنے بیٹے کی شادی پر بلایا تھا تو بھلا میں کیسے نہ آتی اور پھر دل بھی تڑپتا تھا کہ ایک مرتبہ میں ان گلیوں، بازاروں کو دیکھوں جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ ان رستوں پہ چلوں جہاں میں بچپن میں اپنے ابا کی انگلی پکڑ کر چلا کرتی تھی جہاں میں اپنی سکھی خدیجہ کے ساتھ کھیلا کرتی تھا ہے کاجل میری اور تمہاری نانی کی بڑی گہری دوستی تھی اس دوستی کو تمہارے نانی آخری سانس تک نبھایا ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح ہم نے ایک دوسرے سے رابطہ رکھا۔'' بی جان اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''سلام بی جان''۔ چاند نے نعمت خانے میں قدم رکھا۔

''وعلیکم السلام جیتے رہو شکر ہے اللہ کا آ گئے تم باہر کی کیا خبر ہے چاند؟'' بی جان نے نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی اچھی خبر نہیں ہے بی جان''۔ وہ چوکی پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگا۔

''گجرات میں جو آگ بھڑکی تھی اب اتر پردیش، راجستھان، احمد آباد، ہریانہ، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش تک پھیل گئی ہے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو جلا دیا ہے۔ ہزاروں لوگ مارے گئے ہیں۔ بلوائیوں نے مسلمانوں کے خوبصورت گھروں پہ قبضہ کر لیا ہے اور عورتوں کی عزتیں پامال کر رہے ہیں۔ ان کی املاک کو پٹرول چھڑک کر آگ لگا رہے ہیں۔''

''اف خدایا اب کیا ہو گا؟'' کاجل نے خوفزدہ سے انداز میں کہا تو چاند کی نظر اپنی نئی نویلی دلہن پر پڑی۔ اس نے بہت حسرت اور محبت سے اسے دیکھا کیسے حالات میں جی رہے تھے وہ لوگ جہاں محبت کی موجودگی میں وہ باہر جلنے والی نفرت

کی آگ سے جھلس رہے تھے۔

''کاجل ڈرو نہیں بہادر بنو''۔ چاند نے اسے دلاسہ دیا۔

''میں ہوں نہ تم کیوں فکر کرتی ہو''۔ چاند نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بی جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بی جان جب پاکستان بنا تھا تو تب بھی یہی سب کچھ ہوا تھا''۔ چاند نے بی جان سے پوچھا۔

''ہاں چندا پاکستان بھی اسی طرح بنا تھا یہی ظلم و ستم تب بھی ٹوٹے تھے ہمارا تو سارا خاندان اسی مٹی میں رل گیا تھا۔ سب کا خون اسی خاک نے چوسا تھا۔ پر اس کی پیاس نہیں بجھی کیونکہ جس مٹی کو خون کی لت پڑ جائے اس پر خون بہانے کے حیلے بہانے بنتے رہتے ہیں۔'' بی جان نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے بی جان؟'' انیس سالہ کاجل نے پوچھا۔

''بیٹی جن گھروں کے آنگنوں، گلیوں، محلوں اور بستیوں میں خون بہتے دیر نہیں لگتی وہاں اور کیا ہو گا اب تو خون پانی سے بھی سستا ہو گیا اب تو جگہ جگہ دریا بہیں اور بہانے والے بھی بہت''۔ بی جان نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بی جان کیا بھارت پاکستان سے پھر جنگ کرے گا؟ اس نے سرحدوں پہ فوجوں اور اسلحے کے ڈھیر تو خوب لگا رکھے ہیں۔'' چاند نے کہا۔

''بیٹا ہمارے دشمن میں بدلہ لینے کی خو بہت ہو، چاہے لینے کی دینے ہی کیوں نہ پڑ جائیں بزدل اور کمزور دشمن اپنی جلن کی آگ مٹانے کو اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کو یہی کچھ کرتا ہے جو یہاں ہو رہا ہے جلن کی آگ مسلمانوں کے گھروں میں لگائی جا رہی ہے انہیں ٹھنڈا کر کے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے جتن ہو رہے ہیں لیکن جلنے والے کی تو راکھ ہی بنتی ہے چاہے وہ حسد میں جلے یا غصے اور بدلے کی آگ میں جلے چاہے ویسے جلے تیل یا پٹرول ڈال کے جلنے والے کا حسن اور خوبصورتی تو دونوں صورتوں میں مسخ ہیں۔'' بی جان گہرے فلسفیانہ انداز میں بولیں تو کچھ دیر وہ سب خاموشی سے قہوے کے گھونٹ بھرتے رہے۔ پھر

کاجل ایک دم سے پر جوش ہو کر بولی۔

''بی جان جیسے پہلے مسلمانوں نے مل کر پاکستان بنالیا تھا کیوں نہ ہم یہاں کے باقی کے مسلمان بھی اپنا ایک اور پاکستان بنالیں۔ حکومت سے الگ ملک کا مطالبہ کردیں''۔

''میری بھولی بیٹی''۔ بی جان نے ہنستے ہوئے بہت پیار سے اسے دیکھا اور کہا۔

''مطالبہ کرنا بہت آسان بڑا سہل ہے لیکن اسے نبھانا بڑا کٹھن بہت مشکل کام ہے۔ پاکستان کیسے بنا یہ ہم ہی جانتے ہیں میں پندرہ برس کی تھی اس وقت جب پاکستان گئی تھی۔ ماں باپ بہن بھائی سب کچھ مٹا کر جب پاکستان پہنچے تو سر پہ آزاد ملک کی چھت تھی اور پیروں تلے دھرتی ماں کی مٹی جس نے مجھ یتیم کو ماں کی طرح اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔ یتیم خانے میں پلی بڑی تھی جہاں میرے جیسی بیسیوں لڑکیاں بالیاں موجود تھیں۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی پھر وہیں یتیم خانے کی انچارج بنا دی گئی۔ اب تک اس ادارے کی انچارج ہوں وہاں کی سب لڑکیاں میری بیٹیاں ہیں۔ ساری عورتیں میری مائیں بہنیں ہیں۔ سب کا پیار مجھے میسر ہے''۔

''بی جان آپ کا اصل نام کیا ہے سب آپ کو بی جان کیوں کہتے ہیں؟'' چاند نے پوچھا۔

''نام تو بانو تھا مگر اماں ابا پیار دلار میں بی جان کہا کرتے تھے ان کی جان تو مجھ میں بند تھی جیسے بس پھر وہی نام زبان پر چڑھ گیا۔ وہاں جا کر بھی کسی نے پوچھا تو فٹ سے زبان سے بی جان پھسل گیا اور یوں میں سب کی بی جان بن گئی۔ چھوٹے بڑے سبھی مجھے بی جان کہنے لگے''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''بی جان ہم سب مسلمان بھی تو مل کر ایک تحریک چلا سکتے ہیں نا پاکستان بنا سکتے ہیں نا ایک اور اپنا پاکستان''۔ کاجل نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''اچھا تو یہ بتاؤ بیٹا کہ تم پاکستان بنانے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کہاں سے لاؤ گی؟'' بی جان نے مسکرا کر پوچھا تو وہ لاجواب ہو کر ان کو دیکھنے لگی۔

''ہمارے نصیب میں قائداعظم جیسے لیڈر کیوں نہیں ہیں بی جان؟'' چاند نے پوچھا۔

''کیونکہ ہم سب اپنی غرض اپنی مصلحت اور اپنے مفاد کے بندے ہیں اور جو لوگ صرف اپنے لیے سوچتے اور کرتے ہیں وہ دوسروں کو کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ اب تم ہی دیکھ لو کتنا دنگا فساد ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو پٹرول چھڑک کر جلایا اور خنجر اور تلواروں سے کاٹا جا رہا ہے۔ گلیوں محلوں میں ان کی جلی کٹی بے کفن بے گور نعشیں پڑی ہیں یہ ظلم اور بے حسی کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں خون کے دریا بہہ رہے ہیں مگر اقوام متحدہ کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں اور کان بہرے اسے کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا۔ مسلمان خود بے حس بنے ہوئے ہیں انگریزوں کے غلام ان کے مسلمان بھائی بہنوں پر ظلم ہو رہا ہے اور وہ چپ سادھے ہوئے ہیں۔ فلسطین اور افغانستان میں جو ظلم و ستم ہو رہا ہے کیا نہیں جانتے وہ لوگ اور وائٹ ہاؤس والے جنہیں بلیک ہاؤس والے کہنا چاہیے ان کے آلات دوسرے ملکوں کی سرحدوں پر نقل و حرکت تو نوٹ کر لیتے ہیں کیا ان تک ان معلموں کی آوازیں نہیں پہنچ رہیں۔ کیا وہ ستمبر کے واقعہ کے بعد یہ کس طرح بلبلائے اور کس طرح انہوں نے افغانستان پر چڑھائی کی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں بس بیٹے مسلمان تو ہر خطے میں ظلم کا شکار ہو رہا ہے۔

بوسنیا ہو یا فلسطین، کشمیر ہو افغانستان اب افغانستان کی وادی پنج شیر میں کیا ہو رہا ہے۔ مزار شریف، قندھار، کابل میں انسانوں پر کیا قیامت ڈھائی جا رہی ہے کون نہیں جانتا وہاں لوگوں نے انسانی اعضا کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ لوگوں کے جسموں سے گردے نکال نکال کر بیچے جا رہے ہیں۔ دور جہالت کی یاد تازہ ہو رہی ہے اکیسویں صدی میں جو مناسب اور جدید لوگوں اور ملکوں کی صدی کہلاتی ہے یہ ظلم ہو رہا ہے۔ انسانوں کی گردنوں میں رسیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔

انسان ناپ تول کے بیچے جا رہے ہیں اور ساری اقوام عالم بے حس اور خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ضمیر سے خالی ملکوں کا بھی ان جیسا ہی انجام ہوگا دیکھ لینا تم۔ سارے مطلبی، مفاد پرست اور غرض رکھنے والے ہیں۔ آج اگر گجرات اور

دہلی میں مسلمانوں کے خون کی بجائے ان ہندوؤں کا خون بہے تو دیکھنا کیسے ان ملکوں والے حقوق انسانی کے علمبردار بن کے یہاں آتے ہیں''۔

''بی جان آپ تو دنیا کی سیاست کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں''۔ بی جان خاموش ہوئیں تو چاند نے حیرانگی سے کہا۔

''بی جان پاکستان''۔ کاجل ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''بیٹی دعا کرو کہ جو پاکستان بن گیا تھا خدا اسی کو بنائے رکھے۔ پاکستانیوں نے تو پاکستان میں بھی اپنا اپنا الگ الگ پاکستان بنالیا ہے۔ ہم ایک چاند تارے والا ایک ہی پرچم لے کے چلے تھے۔ منزل پہ پہنچے تو سب نے اپنے اپنے پرچم الگ بنالیے۔ منزلیں الگ چن لیں۔ جبھی تو یہ دہشت گردی وہاں بھی پھیلنے لگی۔ جب اپنے ہی گھر کے لوگوں میں اتحاد نہیں ہوگا تو باہر کے لوگ تو شب خون مارنے کی کوشش کریں گے نا۔ 1971ء میں کیا ہوا تھا اسی بے اتحادی کا نتیجہ تھا۔ اپنوں کی غداری نے ملک کے دوٹکڑے کردیئے''۔ بی جان نے بہت دلگیر اور دکھی لہجے میں کہا۔

''بی جان میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت میں ہندوستان میں ہندو اور مسلم ایک ساتھ رہے اور اس سارے عرصے میں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ حالانکہ اس دور میں تو بھگتی تحریک بھی چلی، سکھ مذہب بھی بنا، پانی پت کی لڑائیں بھی ہوئیں، اکبر کا دین الٰہی بھی آیا اور گیا۔ لیکن پورے ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ شہروں، گلیوں، محلوں میں بڑے اتفاق اور محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی غمی خوشی میں تہواروں میں جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے پتا نہیں چلتا تھا کہ تہوار اصل میں کس مذہب کے لوگوں کا ہے۔ اتنا پیار، اتحاد اور سلوک ہونے کے باوجود یہ اچانک مسلم کش فسادات کیوں شروع ہوگئے۔ مسلمانوں کو حقیر کیوں سمجھا جانے لگا بی جان؟'' چاند نے بہت سنجیدگی سے اپنی معلومات ان کے گوش گزار کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب انگریزی کی کارستانی تھی اور انگریز کی سیاست کی بدولت آج

ہندوؤں کے ہاتھ مسلمانوں کے گریبان تک پہنچ گئے۔ انگریز کے آنے سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم مسلمان ریاستیں ختم اور تباہ ہوئیں اور ہندوؤں کو بھی انگریز نے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی جگہ نمائندگی دے کر انہیں باقاعدہ قوت بنادیا۔ انہیں مسلمانوں کی وفاداری پہ اعتبار نہیں رہا تھا چونکہ اقتدار جو چھن گیا تھا۔ مسلمانوں کی وجہ سے ان کا پھر مسلمان بھی اپنے زوال حکومت کی وجہ سے اپنے دفاع کی صلاحیت اور اہلیت کے قابل نہیں تھے۔ بس پھر انگریزی نے بڑی مہارت اور چالاکی سے اپنا سسٹم رائج کیا اور آہستہ آہستہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا شدید دشمن بنادیا۔ نتیجہ وہ دشمنی آج تک باقی ہے۔ ہندوستان تو اب بھی سونے کی چڑیا ہے انگریز کے لیے۔ یہ سپر پاور، خدائی فوجدار جو بنے ہوئے ہیں انہیں اگر آج زرا سا بھی موقع ملے تو وہ شیر کی طرح جھپٹے گا مسلمانوں پر۔ کم بخت انگریز کی نظر میں تو ہر مسلمان دہشت گرد ہے''۔

''یہ سپر پاور بڑی طاقتیں ظلم کیوں نہیں روکتیں؟'' کاجل نے پوچھا وہ سب اٹھ کر کمرے میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ رات آنگن میں اتر رہی تھی۔

''ظلم کرانے والے ظلم کیوں روکنے لگے؟''

کاجل کی ماں نے رضائی ٹانگوں پہ پھیلاتے ہوئے کہا۔

''غریب اور چھوٹے ملکوں کے مسئلے بھی غریب اور چھوٹے ہوتے ہیں ان کی نظر میں اپنے ان کے کتے بھی شاندار بستروں پہ سوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہزاروں لوگ اینٹوں کی چادر پہ لیٹے اپنے وجود کی تھکن مٹاتے ہیں۔ ان کے جانور کتے بلی تک تر نوالہ کھائیں اعلیٰ دودھ پئیں اور غریب کے بچے آنسو پی کر معدے کو تسلی دینے پر مجبور ہیں۔ خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے بے گور و کفن لاشے اگر ان کے پیاروں کے ہوں جلے ہوئے جسموں کی باس میں ان کے اپنوں کی ہو تو تب انہیں ٹیس اٹھے گی اور پتا چلے گا کہ لہو بہانا کیسا اذیت ناک عمل ہے''۔

''بی جان پاکستان اور بھارت ماتا کی دشمنی آج کل پھر زوروں پہ ہے حالانکہ تین دفعہ تو ہار چکا ہے وہ پاکستان سے کارگل کا محاذ بھی بھارت کی ہار ہی تو ہے اب

پاکستان کی سرحد پہ پھر تو پیں فوجیں موجود ہیں جنگ کا خطرہ سر پہ ہے یہاں تو آگ ہی جنگ چھڑی ہے۔ پاکستان والے اس ظلم پہ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں ان کا تو ہم سے گہرا تعلق رہا ہے اور مسلمانوں سے ہمیشہ رہے گا''۔ کاجل نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو بیٹی کچھ تعلق ختم ہونے، ٹوٹنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں اور ہم پاکستانی کیا کریں ہمارے تو اپنے گھر میں آگ لگی ہے۔ دہشت گردی، تخریب کاری، فرقہ وارانہ، صوبائی لسانی اور مذہبی تعصبات اور اختلافات کی آگ اور معیشت کی کمزور مہنگائی کی کثرت کی آگ جس کی لپیٹ میں امیروں، بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کے علاوہ سب جھلس رہے ہیں۔ پہلے سے رنجور فکروں، پریشانیوں کی آگ میں جلتے لوگ تو اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ کسی کو سوگ منا سکیں، کسی کو پرسہ دے سکیں یا کسی سے تعزیت کرسکیں۔ پھر بھی کرم ہے اللہ کا کہ یہاں جیسے حالات نہیں ہیں اپنا وطن ہے آزادی سے سانس تو لے سکتے ہیں وہاں ہر وقت کا خوف سر پہ تلوار بن کے تو نہیں لٹکا احساس تحفظ یہاں سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ اللہ اسے اور زیادہ کرے۔ رہی بات دشمن کے سرحدوں پہ جمع ہونے کی تو بہت ہو تو آگے بڑھیں یہ لالے نہ ان کی بار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی۔ ہندوؤں نے سرحدوں پہ فوجیں لڑائی کی غرض سے اکٹھی کی ہیں جبکہ پاکستان والوں نے اپنے دفاع کے لیے کہتے ہیں کہ دشمن اگر گھر کے دروازے پر کھڑا ہو تو دروازے کی کنڈی مضبوط کرلینی چاہیے''۔ بی جان نے سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بی جان پاکستان تو اسلام کا قلعہ ہے پھر وہاں یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ وہاں بم دھماکے، مسجدوں، امام بارگاہوں پر فائرنگ کیوں؟ یہ ایک خدا ایک نبی اور ایک قرآن کو پڑھنے والے اتنے خانوں میں کیوں بٹ گئے ہیں۔ چاند کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

''بیٹا اب پاکستان اسلام کا قلعہ نہیں ریت کی دیوار بنتا جا رہا ہے اس لیے کہ اس کے رہنے والوں نے کمزور کردیا ہے۔ آپس میں دست و گریبان ہوں گے اپنے ہی خون سے ہاتھ رنگیں گے تو قلعہ کیا خاک مضبوط رہے گا اور اسلام کیا یہ درس سکھاتا

ہے کہ بھائی بھائی کا گلا کاٹے، یتیم کا مال ہڑپ کرلے۔ بیواؤں کے سر سے چھت چھین لے۔ نہیں میاں نہیں اسلام تو دینے والا دین ہے یہ تو دیتا ہی دیتا ہے۔ قاتل کو بھی انصاف دیتا ہے اور مقتول کو بھی۔

اسلام نے تو سب کچھ دیا ہے مگر اسلام کے ماننے والوں نے کبھی اس پہ غور ہی نہیں کیا۔ زبان سے کلمہ تو پڑھ لیا دل میں عمل کا شوق ندارد۔ ''عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی'' علامہ اقبال نے صحیح فرمایا تھا اب دیکھ لو غلط عمل سے دنیا میں ہی جہنم کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم لوگ کہ نہیں جنت کی زندگی کے لیے عمل صالح کرنے پڑتے ہیں۔ اچھا عمل کرو درگزر کی خوبی پیدا کرو اپنے اندر تو یہاں بھی راحت وہاں بھی جنت''۔ بی جان نے چاند کی بات سن کر قدرے جلال میں آتے ہوئے کہا وہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ کاجل اس کے قریب ہی بیٹھی تھی اور بہت توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''آج سونا نہیں ہے کیا؟'' کاجل کی ماں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو دس ہی بجے ہیں اور ایسے خوفزدہ اور غیر محفوظ ماحول میں نیند کسے آتی ہے ماں جی؟'' چاند نے رضائی میں ٹانگیں گھساتے ہوئے کہا۔

''سچ کہتے ہو بیٹا نیند کیسے آسکتی ہے ایسے ماحول میں مجھے تو یوں لگے جیسے آگ اور شور قریب آتا جا رہا ہے۔'' بی جان نے کہا تو کاجل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم کہیں جا بھی نہیں سکتے باہر بہت خطرہ ہے اور اب تو کرفیو بھی لگ گیا ہے''۔

کاجل کی ماں بتی بجھا دے کہیں بلوائیوں کی نظر نہ پڑ جائے ادھر''۔ بی جان نے کہا۔

''اچھا بی جان۔'' کاجل کی ماں نے اٹھ کر ٹیوب لائیٹ بند کردی اور چھوٹا لیمپ جلا کر نیچے سٹول پہ رکھ دیا۔ کمرے کے سارے پردے برابر کردیئے باہر روشنی نظر آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے ہی آگ کھینچی چلی آئے تو یہ نصیب کی بات تھی۔

کاجل کی ماں ساری احتیاط کر کے دوبارہ رضائی میں آ گھسی۔

''آہ ہا یہ تو وہی سب ہو رہا ہے جو پاکستان بنتے سے ہوا تھا''۔ بی جان نے دکھ بھری آہ بھر کے کہا۔

''ان ہندو بلوائیوں نے ایسا خونی کھیل کھیلا تھا کہ یہ ساری دھرتی لہو سے رنگی گئی تھی۔ ماؤں سے ان کے بچے چھین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بہنوں، بیٹوں کی ردائیں سروں سے جھپٹ لیں۔ عزتیں تار تار ہوئیں عجیب نفسا نفسی کا سماں تھا۔ جہاں اپنوں کے جدا ہونے کا غم تھا وہاں آزاد وطن میں آزادی سے زندگی گزارنے کی خوشی تھی۔ خون کی چنری اوڑھ کر پاک وطن کی سرزمین دلہن بنی جہیز میں لاشوں کا ڈھیر ملا ابھی اس دلہن کا گھونگھٹ بھی نہیں اٹھا تھا۔ کم بخت مکار ہندو توپوں گولوں کی سلامی دینے چلے آئے۔ وہ تو نئی سہاگن کے بھاگ بخت آور تھے کہ سب لال، بلال، پوت سپوت ایکا کر کے گئے اور دشمن کے دانت کھٹے کر آئے۔

پھر جب آنچل لہرانے کے دن نکلے تو بد بخت پھر دانت تیز کر کے لپکے اور جہاں غیرت، عزت اور آن والے سپوت ہوں وہاں کسی کی کیا مجال کے کوئی اس دلہن (پاکستان) کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔ بس سب نے آنے والوں کی آنکھیں پھوڑ دیں اور اس کا بدلہ انہوں نے یوں لیا کہ دلہن کی چنری کا ایک کونہ چاک کر دیا۔ یوں بنگلہ دیش بنا۔ اپنوں کا دشمنوں کا میل جول جو ہو گیا تھا دلوں میں لالچ، طمع، حرص و ہوس، خود غرضی اور مفاد پرستی کا بیج ڈل گیا تھا وہی پروان چڑھنے لگا۔ اب اس درخت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور شاخیں پھیل گئیں ہیں کوئی تو ہو جو اس درخت کی جڑ کاٹے تو پھر سے بہار اترے آنگن میں۔ ہائے اے ماں دلہن کی مانگ میں سیندور رہی نہ افشاں، خاک اڑتی نظر آئے ہے''۔ بی جان کا لہجہ بھیگا ہوا تھا بوڑھی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ چاند نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بی جان یہ خاک اور گرد صاف کرنے کو جوان جذبے لیے مرد آہن، مرد کہن اترے تو ہیں میدان میں۔ دیکھیے گا ایک دن کیا چکا چوند ہو گی اس دلہن کی مانگ میں''۔

''ہاں اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' بی جان نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''بی جان سنا ہے پاکستان بھر میں الیکشن کی تیاری ہو رہی ہے''۔ چاند نے بی جان کی توجہ دوبارہ پاک وطن کی طرف مبذول کرواتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں اربوں روپیہ اٹھ جائے گا انتخاب پہ اور اگر اب کی بار بھی پہلے سے سیاست دان حکومت میں آ گئے تو وطن پرستوں، محبّ وطن اور جانثاروں کا اعتبار بھی اٹھ جائے گا۔ میں تو کہوں یونہی چلتا رہے۔ انتظام کیا ضرورت ہے یہ وقت اور پیسہ برباد کرنے کی۔ اب کوئی قائداعظم تو آنے سے رہا۔'' بی جان نے تاسف اور کرب سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بی جان مگر یہ بھی دیکھیے پاکستان کے رہنے والے ہی تو کرتے ہیں کہ بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے اچھی ہے''۔ چاند نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے بکتے ہیں''۔ بی جان نے غصے سے کہا۔ ''انگریز کا کہا سنا جملہ دہراتے رہتے ہیں۔ کتنی دفعہ الیکشن ہوئے جمہوریت آئی اور اپنے بدترین اثرات چھوڑ کے گئی۔ ان سیاستدانوں کو تو بس کرسی چاہیے۔ جو چاروں طرف گھومے اور ملک بھر کے سارے خزانے ان کی جھولی میں کھینچ لائے اور وہ انہیں اپنی جھیلوں اور بینکوں میں بھر کے چلتے بنیں۔ کرسی پہ بیٹھے ہیں تو سب اچھا ہے جونہی ان سے کرسی چھیننے لگے واویلا کرنا شروع کر دیا۔ تب انہیں ملک میں مہنگائی اور بے روزگاری بھی نظر آنے لگتی ہے۔ بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بل بھی کاٹنے لگتے ہیں۔ غریب عوام کو مہنگائی سے ٹوٹتی کمر کی آواز بھی ان کے کانوں میں پڑنے لگتی ہے کرسی پہ بیٹھنے والا دنیا کا سب سے بڑا بے ایمان اور جھوٹا شخص لگتا ہے انہیں اس کی جگہ انہیں بٹھا اور معاملہ پھر سے سیٹ ہو جائے گا۔ ہر طرف چین کی بانسری بجنے لگے گی۔ لعنت ہے ایسی سوچ اور سیاست پر جو ملکی اور قومی مفاد سے عاری ہو۔ جمہوریت کو مذاق اور ملک کو تماشا بنا کے رکھ دیا ایسے مفاد پرست سیاستدانوں نے۔ عوام کو سبز باغ دکھا

کے اور اپنے لیے محل اور انڈسٹری لگا انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ اے میرے وطن تیرے دامن تار تار کی خیر۔ خدا کرے جلد حالات معمول پر آئیں اور میں اپنے پاک وطن میں تو لوٹ آؤ بس سروس بھی بند کر دی ہے اور فضائی بھی۔'' بی جان ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''پتا نہیں یہ پابندی کب تک رہے آپ اپنے ملک کیسے واپس جائیں گی بی جان؟'' کاجل نے پوچھا۔

''ابھی بی جان''۔ جواب میں کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ یک بیک شور برپا ہوا۔ آگ، آگ کا شور سن کر وہ چاروں بھی گھبرائے۔ کاجل جان کی آغوش چھپ گئی۔ گھر سے باہر بلوائیوں کا شور جاری تھا۔ وہ گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور پھر ایسی آگ لگی کہ محلے بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بی جان اور کاجل کو اس کی ماں اور چاند نے جلدی سے کمرے کے نیچے تہہ خانے میں اتار دیا۔

''ماں جی آپ بھی چھپ جائیں آگ ادھر کا رخ کر رہی ہے۔ لگتا ہے بلوائیوں نے دروازہ توڑ دیا ہے۔'' چاند نے ماں کو شانوں سے پکڑ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔ چاند کاجل کی ماں یعنی کلثوم کے بھائی کی اولاد تھا۔ جسے اس نے ہی پالا تھا۔ ماں باپ مر گئے تھے چاند کے اور تب سے اب تک کاجل کی ماں ہی ان کی ماں تھی اور اسے بھی اس سے بیٹے جیسی محبت تھی۔ وہ چاند کو کاجل سے بھی بڑھ کر پیار کرتی تھیں۔ وہ بہت نیک، کماؤ اور فرمانبردار تھا اب بھلا ایسے کڑے وقت میں وہ اپنے بیٹے کو ان کے حوالے کر کے خود کیسے چھپ سکتی تھی۔

''چاند بیٹا تو بھی تہہ خانے میں اتر جا جلدی کر میرے چاند''۔ کلثوم نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماں جی پہلے آپ اتریں۔ ماں جی''۔ وہ چلایا پیچھے سے کھڑکی ٹوٹی تھی۔

اس نے ماں کو پیچھے کیا خود آگے دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ ایک بلوائی چھرا اور پستول لہراتا کمرے میں کود گیا۔ چاند اس سے الجھ گیا اور بلوائی کے خنجر نے اس کے

دل کو چیر دیا۔ اس کی دل دوز چیخ فضا کی دہشت میں مزید اضافہ کر گئی۔ کاجل کی ماں چیخ کر اس کی طرف لپکی تھی اسے اپنی ممتا بھری آغوش میں سمیٹنے کے لیے مگر بلوائی کے پستول کی گولی نے اس کی سانسیں بھی ختم کر دی۔ دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کے قریب ابدی نیند سو گئے تھے۔

کاجل کو کہاں چھپایا ان مسلوں نے وہ سندر کنیا کہاں گئی آخر؟'' اب وہ بلوائی سارے گھر کے کمروں میں کاجل کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ نیچے تہہ خانے میں کاجل بی ماں کے سینے سے چمٹی سہمی بیٹھی رو رہی تھی۔

''بی جان ماں جی اوپر ہیں اور وہاں ابھی گولی چلی تھی''۔

''صبر بیٹی صبر''۔ بی جان نے بھیگتی کانپتی آواز میں مدھم سی سرگوشی کی۔

شور تھم گیا، بلوائیوں کے گرجنے کی آوازیں آنا بند ہوئیں تو بی جان چپکے سے ڈرتے ڈرتے کاجل کو لے کر تہہ خانے سے باہر نکل آئیں جہاں دھواں ہی دھواں تھا۔

''بی جی ___ چاند ___ چاند''۔ کاجل کی نظر جونہی ماں بیٹے کی لاشوں پر پڑی وہ صدمے سے چیخ اٹھی۔ بی جان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ وہ جہاں کھڑی تھیں وہیں بیٹھ گئیں۔ کاجل کبھی اپنی ماں کو اور کبھی اپنے شوہر چاند کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ پکار رہی تھی۔

''ماں جی اٹھو ___ چاند تو کیوں ڈوب گیا۔ تو تو مجھے اپنے ساتھ لے کے جانا چاہتا تھا پھر مجھے کیوں چھوڑ گیا۔ چاند اٹھو نا چاند۔'' کاجل چلا رہی تھی رو رہی تھی اس کی آنکھوں سے سارا کاجل بہہ گیا تھا۔ اس کی مانگ اجڑ گئی تھی۔ بی جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کاجل بیٹی اپنے دل کو سنبھالو بیٹیا کہ جس میں ابھی سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے''۔

''نہیں اب کچھ نہیں ٹوٹے گا بی جان اب کچھ نہیں ٹوٹے گا سب کچھ تو ٹوٹ گیا سب کچھ ٹوٹ تو گیا ___ بی جان ___ چاند''۔ کاجل کی روتی، اٹکتی آواز ٹوٹ گی۔

وہ چاند پر گری اور پھر اٹھ نہ سکی۔ اس کی سانس کی ڈور جو ٹوٹ گئی تھی۔ جو چاند کے دل سے بندھی تھی وہ اس کے پاس چلی گئی تھی۔

''کاجل تو بھی گئی تو بھی چلی گئی کیسا وفادار دل تھا تیرا تیرے چاند کے ساتھ ہی ڈوب گیا''۔

بی جان اپنی چادر میں منہ دیے سسکیاں لیتے ہوئے بولیں۔ ان کے بوڑھے چہرے پر جھڑیوں کا جال بچھ گیا تھا۔ جس میں غم، دکھ، زخم، جدائی اور موت کی اذیت کی جھریاں بنی تھیں۔ وہ سراپا غم کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے سر پہ تنے آسمان کو اپنی بھیگتی آنکھوں سے دیکھا جہاں دھیرے دھیرے ماتمی تاروں کی صف بچھ رہی تھی۔ آسمان کے چاند کو دیکھ کر ان کی نظر اپنی زمین کے بے روح چاند پر گئی تو ان کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

ہر بام کا چاند لٹ گیا آج پھر وہی ہوا جو بچپن سال پہلے ہوا تھا۔ بی جان جنگ آزادی کے دکھوں کو یاد کر رہی تھیں۔ تب میں اور اب میں صرف اتنا فرق تھا کہ تب مسلمانوں نے اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا جس کی پاداش میں انہیں جلایا گیا نیزوں، تلواروں کرپانوں سے گاجر مولی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا لیکن اب کوئی مطالبہ نہیں تھا ہندو نے اپنی پانچ ہزار سال پرانی دشمنی نکالی تھی وہ مسلمانوں سے بدلہ لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ گاؤں کے گاؤں جل رہے تھے۔ مسلمان مر رہے تھے۔ ہر گلی، کوچے، سڑک، چوک اور بازار میں مسلمانوں کی جلی کٹی لہولہو لاشیں پڑی تھیں۔ تیرگی تھی کہ امنڈتی ہی چلی آ رہی تھی۔ شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا تھا۔

یہ ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت تھا۔ زمین کی گود میں انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ زیست کی تنہائیاں گم ہو گئیں تھیں۔ زیست کا وماں کوئی نہیں تھا۔ بی جان بیٹھی سوچ رہی تھیں اپنا بھیگا ہوا دامن لیے وہ چاند کاجل اور کاجل کی ماں کے ٹھنڈے بے جان جسموں کو دیکھ رہی تھیں۔

''تم سب چلے گئے میں بھی تمہارے پیچھے آؤں گی تم تو نہیں اب آؤ گے کہ بھلا

کیسے ہیں یہاں جا کے لوٹ آنے کا بار۔ اس گھر کے چولہے میں پچپن برس میں اتنی آگ نہیں لگی جتنی آگ اس پورے گھر میں ایک دفعہ میں لگ گئی۔ گھر میں کبھی ہانڈی نہ جلی تھی مگر پورا گھر جل گیا۔'' بی جان ٹھہر ٹھہر کر دبی دبی ہچکیوں میں آنگن میں اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے دکھ سے بولیں۔

''نہ کفن دینے والا ہے کوئی نہ جنازہ اٹھانے، نہ نماز پڑھانے والا نہ اذان دینے والے ہیں یہ تو ہونا ہی تھا اگر دنیا بھر کے مسلمان متحد ہوتے تو کہیں بھی مسلمان یوں اپنے خون میں نہ ڈوبے ہوتے۔ اس طرح سے نہ مارے جاتے''۔ ہوا بین کرتی ہوئی درد کی پازیب بجاتی گزری تو بی جان نے گہرا سانس لے کر اس سے کہا۔

''اے ہوا میرے ملک جائے تو وہاں کے رہنے والوں سے کہنا کہ پاکستان اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اس کی حفاظت اور قدر کرو اس کا خیال رکھو اسے مضبوط بناؤ یہ ملک تمہیں کچھ دے نہ دے تو بھی اس کا یہ احسان یاد رکھو کہ اس نے تمہیں اپنا پن دیا ہے۔ احساس ملکیت، احساس تحفظ دیا ہے وہاں تمہیں بلوائیوں کا ڈر نہیں ہے۔ تم سچے اور پکے مسلمان بنو اور صحیح معنوں میں اس ملک پاکستان کو اسلام کا قلعہ بناؤ''۔

اے صبا شاید تیرے ہمراہ یہ خوفناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف

دور سے کسی مرغے کی بانگ سنائی دی تو بی جان نے نماز کا قصد کیا۔ آنسوؤں سے وضو کیے۔ وہ کانپتی لرزتی ٹانگوں سے اٹھنے لگیں تو کسی کے قدموں کی چاپ پر وہیں آ گئیں۔ انہیں لگا جیسے ان کی موت کی آواز ہے وقت رخصت آن پہنچا ہے۔ سامان سمیٹنے کا سماں ہے۔ چاپ دروازے پر آ کر رکی کچھ لمحے بیت گئے۔ پھر بی جان کے کانوں میں حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

''تو تو زندہ ہے بانو بڑھیا''۔ ایک بوڑھے ہندو مرد کی کرخت آواز ان کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا مگر پہچان نہ سکی۔

''کون ہے تو اور مجھے کیسے جانتا ہے؟'' بی جان نے ہمت کر کے پوچھا۔

''میں سورتا رام ہوں تیرا پرانا دشمن یاد ہے تجھے تیرے گھر کے برابر والا مکان

تھا ہمارا تو تب تو پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتی چلی گئی تھی سارا پری وار (خاندان) یہاں کٹ مرا تھا۔ ایک تو ہی تتلی کی مانند اڑ گئی تھی اور میں دیکھتا رہ گیا یاد ہے مجھے میں جب تم سے کہا تھا اپنے سندرتا روپ کے خزانے سب کچھ مجھے دان کر دو تو تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تھا میں تب سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ بڑی پرانی دشمنی ہے میری تجھ سے''۔ وہ خنجر لہراتے ہوئے بولا۔

''اچھا تو یہ تو ہے بڈھا سورتا رام تیری کمینگی آج بھی پہلے جیسی ہے بوڑھا ہونے کے باوجود کینہ تیرے دل سے نہیں نکلا یہی مجھے بتانے آیا ہے''۔ بی جان نے اسے پہچانتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں ضرور بوڑھا ہوا ہوں مگر دشمنی بوڑھی اور کمزور نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی ہے جب سے مجھے پتا چلا تھا کہ تو یہاں آئی ہوئی ہے انتقام کی آگ اور بھڑک اٹھی ہے''۔ سورتا رام نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا کرے گا تو؟''

''تیری ہتھیا (قتل) تیری موت تجھے یہاں کھینچ لائی ہے بانو''۔ وہ ہنسا۔

''موت تو میری سکھی سہیلی ہے اس سے نہ میں کل ڈری تھی نہ آج خوف کھاؤں مجھے جو کرنا ہے کر لے میری نماز کا وقت ہو چلا ہے''۔ بی جان نے اطمینان سے کہا۔

''تیری نماز پڑھانے کا بندوبست کرنے ہی تو آیا ہوں پر یہاں کون تیری اور تیرے ان چاند ستاروں کی نماز پڑھائے گا۔ تم مسلے ہمارے چتا جلانے پہ اعتراض کرتے تھے نا دفنانے کی بات کرتے تھے اب دیکھا تم نے ہم نے کس طرح تمہیں جلایا ہے۔ تم لاکھ مسلے (مسلمان) سبھی پر مرو گے تو ہندو کی موت ہی۔ تمہاری چتا کو میں خود آگ لگاؤں گا۔ دیکھے نہیں کتنے جل مرے نہ کسی کی قبر بنی نہ کفن ملا۔ نہ مزار بنا نہ فاتحہ پڑھی گئی نہ کسی نے پھول چڑھائے''۔ وہ تمسخرانہ اور سفاک لہجے میں بولا۔

''مظلوم کی موت تمہاری موت ہے اور مسلمان کی موت جذبہ ایمانی سے سرشار کلمہ حق کہتے ہوئے آ جائے تو اسے پھولوں کی کیا کمی۔ وہ تو اسے اصلی ابدی اور اللہ کے گھر میں ملیں گے تم اپنی فکر کرو سورتا رام یہاں بھی جل کر راکھ وہاں بھی

جل کر خاک نہ اس کروٹ گلاب نہ اس کروٹ سکھ چین۔ اللہ اکبر، اللھم لبیک، اللھم لبیک (اے اللہ میں حاضر ہوں تیرے دربار میں میں حاضر ہوں تیرے سامنے، تیرے دربار میں''۔ بی جان نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد نماز فجر کی نیت کی اور قبلہ رو ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ رکوع کی حالت میں تھیں کہ سوتا رام کا خنجر ان کی پشت میں پیوست ہو گیا اور اللہ اکبر کہتے ہوئے انہوں نے سجدے میں اپنا سر رکھ دیا۔ رب کے دربار میں سر رکھتے ہی ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے خون سے زمین سرخ ہو گئی۔ وہ اللہ کے دربار میں پہنچ گئیں تھیں۔ ان کے پیچھے کئی سوال کئی وسوسے کئی باتیں اس خوفناک فضا میں جلتے ہوئے بام و در میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

آخر مسلمان کب متحد ہوں گے؟ ہم ہندوؤں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر بھی یہ آگ نہیں بجھا سکتے۔ بہتر ہے کہ اپنے پھولوں کی ڈال سے کانٹے الگ کر دیں چند ہاتھ، چند انگلیاں زخمی ضرور ہوں گی مگر پھولوں کی مہک اور ملامت جلد ہی ان زخموں کو مندمل کر دے گی۔ اپنا دراز بند اور گھر مضبوط ہو تو باہر والے خود بخود کمزور پڑ جاتے ہیں۔ امن کا نعرہ لگانے اور فاختہ کے منہ میں زیتون کی شاخ پکڑانے سے امن قائم نہیں ہوا کرتا اس کے لیے غور کرنا پڑتا ہے۔ جو کروڑوں مسلمانوں کو بھارتی شہری تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی عبادت گاہوں، تہواروں اور رسم و رواج کو تحفظ نہیں دیتے۔ وہ پاکستانیوں کو اپنا دوست کیونکر ماننے لگے۔ وہ تو بھارت ماتا کے بٹوارے پر ہمیں اپنا مجرم سمجھتے ہیں۔ انہیں پھول بھیجنے سے بہتر ہے کہ ہم آپس میں پھول بانٹیں۔ آپس میں اتحاد اور پیار بڑھائیں۔ کام مشکل ہے ناممکن تو نہیں ہے اندھیرا بڑھ گیا تو کیا ہوا روشنی بھی تو ہم ہی کو کرنی ہے۔ کوئی روشنی کی کرن باہر سے نہیں آئے گی۔ ہم ہی میں سے پھوٹے گی اور اندھیرے شہر میں تو ایک مشعل ہی کافی ہوتی ہے۔ ہاں لیکن اندھوں کے شہر میں ان گنت مشعلیں بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

☆☆☆

جگنو

وہ اپنی کلاس ختم ہونے پر باہر نکلی تھی کہ کسی مضبوط وجود سے ٹکرا گئی اور اس سونڈ بونڈ شخص کو دیکھتے ہی غصے سے بولی۔

''اندھے ہو کیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتے؟ پرے ہٹو اندھے نہ ہو تو''۔

''اندھا نہ ہوتا ...... تو آپ سے نہ ٹکراتا۔ مس! معافی چاہتا ہوں۔ اگر آنکھوں والوں کا یہ حال ہے تو مجھ نابینا پر کیسا غصہ؟'' وہ شخص جو ستائیس اٹھائیس برس کا دکھائی دے رہا تھا بہت مہذب اور نرم لہجے میں گویا ہوا، تو جگنو پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''اوہ آئی ایم سوری! کیا آپ دیکھ نہیں سکتے؟'' جگنو نے شرمندگی سے پوچھا۔

''دیکھ سکتا ہوں۔ مگر وہ سب نہیں جو آپ جیسے لوگوں کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ میں دل کی آنکھ سے دیکھتا ہوں دل کی آنکھ باہر کے منظر اور ہی رنگ سے دکھاتی ہے''۔

''میں جگنو ہوں''۔ جگنو نے اپنا تعارف کرایا۔

''عجب ہے۔ جگنو ہو کر بجائے راستہ دکھانے کے آپ خود ٹکراتی پھر رہی ہیں''۔

''ہوتا ہے سر! کبھی کبھی دوسروں کو راستہ دکھانے والے خود بھی بے سمت، بے راہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اندھیروں میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں''۔ جگنو افسردگی سے

بولی۔

''آپ ستم رسیدہ محسوس ہوتی ہیں۔ ویسے ناچیز کو محسن رحمان کہتے ہیں۔ یہاں اپنے بھتیجے زین رحمان کو لینے کے لیے آیا تھا''۔ محسن رحمان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

''آپ زین رحمان کے چچا ہیں؟''

''جی ہاں''۔

''زین بہت لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ میں اس کی کلاس کو میتھ اور انگلش پڑھاتی ہوں''۔ جگنو نے مسکراتے ہوئے بتایا وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کا نام سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ وہی مس جگنو ہیں، جن کا گھر پہ زین اکثر بڑی محبت اور عقیدت سے ذکر کرتا ہے۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر بات کر کے''۔

''مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے''۔ جگنو نے ایمانداری سے کہا۔

''ایک اندھے سے مل کر آپ کو خوشی ہو سکتی ہے؟ میں نابینا ہوں۔ اندھیرا ہوں''۔

''جگنو کی روشنی بھی اندھیرے میں ہی اجاگر ہوتی ہے۔ اجالا کرتی ہے۔ اندھیرا نہ ہو تو جگنو کی اہمیت کسی پر عیاں نہ ہو سکے۔ خود جگنو پر بھی نہیں۔ وہ اندھیرے میں آئے بغیر اجالے کی قدر و قیمت جان ہی نہیں سکتا۔'' جگنو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''باتیں اچھی کرتی ہیں آپ''۔

''شکریہ! آپ ٹھہریے میں زین کو بھیجتی ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ کلاس روم میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد زین اپنا سکول بیگ اٹھا کر باہر آ گیا اور محسن رحمان کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور جگنو کی نگاہیں دور تک اس گریس فل شخص کو جاتے دیکھتی رہیں۔

تجمل حسین اور رقیہ بانو کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹا ارسل

حسین اور اس سے پانچ سال چھوٹی جگنو حسین۔ تجمل حسین ایک ہائی اسکول کے پرنسپل تھے اور رقیہ بانو بھی لڑکیوں کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ارسل اور جگنو کو انہوں نے بہت محبت اور محنت سے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا تھا۔ ارسل ایم۔ کام کرنے کے بعد ایک بینک میں ملازم ہوگیا تھا اور اس کی شادی تجمل حسین نے اپنی اکلوتی بھانجی ثمینہ سے کردی تھی۔ جگنو نے بی۔ اے۔ بی ایڈ کرکے اسکول میں ملازمت اختیار کرلی تھی اور ساتھ ساتھ ایم۔ اے کی تیاری بھی کررہی تھی۔ تجمل حسین اور رقیہ بانو ڈیڑھ سال پہلے سڑک کے حادثے میں انتقال کرگئے تھے اور جگنو کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ ثمینہ بھابھی کو ساس سسر کے دنیا سے پردہ کرنے کی دیر تھی۔ انہوں نے روایتی بھاوج کا روپ دھارلیا۔ دو بیٹے تھے ان کے اور بیٹوں کی ماں ہونے کا زعم بھی الگ تھا۔ شوہر کو بھی قابو میں کرلیا تھا اور جگنو پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالے جاتے۔ اسے ایک بوجھ سمجھا جاتا اور اسے احساس بھی دلایا جاتا کہ وہ اپنے بھائی پر بوجھ ہے۔ صبح کا ناشتہ بنانے کے علاوہ برتن دھونے، کچن کی صفائی کرنے کے بعد جگنو تیار ہوکر اسکول جاتی تھی۔ بھابھی صرف دوپہر کا کھانا پکاتی تھیں اور اکثر اوقات جگنو کو روٹیاں اسکول سے آکر پکانا پڑتی تھیں۔ رات کا کھانا پکانے اور کچن کی صفائی کرنے کے علاوہ سب کے کپڑے وہ ہفتے میں ایک دن واشنگ مشین لگا کر دھویا کرتی اور رات کو کپڑے استری کرتی۔ پھر بھی ثمینہ بھابھی کے منہ کی گھڑی پر وقت بارہ ہی بجے رہتے تھے۔ ارسل سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش تماشائی بنے رہتے۔ وہ جگنو کی شادی کردینا چاہتے تھے۔ مگر ثمینہ بھابھی جگنو کو بغیر جہیز کے بیاہنے کی بات کرکے ہر آنے والے رشتے کو ٹھکرا دیتی تھیں۔ لہٰذا بات سارے خاندان اور محلے والوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ مگر اس طرح کے قصوروار جگنو ٹھہرائی گئی تھی۔ ثمینہ بھابھی نے یہ بات سب میں مشہور کردی تھی کہ جگنو کی شرط ہے کہ ”میں اس شخص سے شادی کروں گی۔ جو مجھے تین کپڑوں میں بیاہ کر لے جائے گا۔ میرے ساتھ جہیز نہیں مانگے گا۔ مجھے قبول کرے گا۔ جہیز لینے سے انکار کردے گا۔“

اور بھلا مادیت پرستی کے اس دور میں بغیر جہیز کے خالی خولی لڑکی کو کون بیاہنے آتا ہے۔ اب تو لوگ سب کچھ چاہتے ہیں لڑکی خوبصورت، خوب سیرت ہو، تعلیم یافتہ ہو، ملازمت کرتی ہو تو یہ ایکسٹرا خوبی شمار کی جاتی ہے اور گھر بھر کے جہیز لے کر آئے تو سر آنکھوں پہ ورنہ پاؤں کی جوتی اور پیشانی کی شکن بن کر رہ جاتی ہے بے چاری لڑکی۔

جگنو، بھابھی کی چالاکیاں خوب سمجھ رہی تھی۔ مگر اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ بھائی پر اس کی معاشی ذمے داری کا بوجھ نہیں پڑ رہا تھا۔ ورنہ تو ثمینہ بھابھی نے اس کا جینا بالکل ہی دوبھر کردینا تھا۔ گھر ارسل اور جگنو کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس کا بھی ثمینہ بھابھی کو غصہ تھا۔ وہ گھر اپنے یا مکمل طور پر ارسل کے نام لکھوانا چاہتی تھیں اور کئی بار اس کی کوشش کرچکی تھیں۔ مگر ہر بار ارسل نے یہ کہہ کر ان کے ارادوں کو ملیامیٹ کردیا تھا کہ ”جگنو اس گھر کے آدھے حصے کی قانونی وارث ہے۔ میں اگر جگنو کو جہیز نہ بھی اپنی جیب سے بنا کردوں۔ تب بھی جگنو کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس گھر میں سے اپنے آدھے حصے کا مطالبہ کرکے اپنے حصے کی رقم سے اپنا گھر بسانے کا سامان کرسکے۔ تب ہم کہاں جائیں گے؟ کرائے کا گھر میں افورڈ نہیں کرسکتا اور جگنو کا حق بھی میں نہیں مار سکتا۔ وہ میری سگی اور اکلوتی بہن ہے۔ آئندہ گھر اپنے یا میرے نام لکھوانے کی بات مت کرنا“۔

محسن رحمان، رحمان بیگ اور سعدیہ رحمان کا بیٹا تھا۔ محسن سے بڑے احسن رحمان تھے دو ہی بھائی تھے وہ محسن رحمان کے والد رحمان بیگ بہت بڑے بزنس مین تھے۔ دونوں بیٹوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن اور ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد الگ الگ بزنس شروع کردیا تھا۔ احسن شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے۔ دو بیٹے زین، حسنین اور بیٹی حورین، بیوی اسماء بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ محسن کا تقریباً ایک سال پہلے گھر کی سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا تھا۔ سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور اس حادثے نے محسن کو اس کی بینائی سے محروم کردیا تھا۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ مسلسل علاج سے شاید بھی اچانک اس کی بینائی واپس لوٹ آئے۔
ڈاکٹرز پر امید تھے۔ محسن کا علاج بھی جاری تھا۔ محسن کا نابینا ہو جانا خود محسن کے لیے
کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔ لیکن محسن کے ماں باپ اور
بھائی، بھابھی بھی اس کی معذوری پر شدید صدمے کی حالت میں تھے اور محسن کی بینائی
کی بحالی کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتے تھے۔ محسن کی منگنی اس کے ماموں کی بیٹی شہلا
سے ہو چکی تھی۔ مگر محسن کے نابینا ہو جانے پر شہلا نے اپنی منگنی یہ کہہ کر توڑ دی کہ ''میں
ایک معذور شخص کے ساتھ معذور زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کا
کوئی شوق نہیں ہے''۔

اور محسن اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ گھر والوں نے اسے سمیٹا، سنبھالا اور
بالآخر وہ سنبھل گیا۔ اس نے اپنی اس معذوری کو تسلیم کرلیا اور زندگی کے معمولات
میں پھر سے خود کو ایڈجسٹ کرنے لگا۔

''جگنو! یہ تم رات رات بھر کمرے میں بجلی، پنکھا چلائے کیا کرتی رہتی ہو؟ کچھ
معلوم بھی ہے اس بار بجلی کا بل پورے اٹھارہ سو روپے آیا ہے۔'' ثمینہ بھابھی نے
اس کے کمرے میں آکر اسے سخت لہجے میں کہا۔

''جانتی ہوں''۔ وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔ ''تو تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ
تمہارے بھیا بینک منیجر ہیں، بینک کے مالک نہیں ہیں کہ ہر مہینے اتنا زیادہ بل ادا
کر سکیں''۔

''بل کیا وہ تو بہن کی شادی کا فرض بھی ادا نہیں کر سکتے اور بھابھی! بجلی کا بل
اکثر میں ہی جمع کراتی ہوں۔ اس مہینے کا بل بھی میں جمع کرادوں گی۔ حالانکہ میں
پورے دن میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے اپنے کمرے میں بجلی استعمال کرتی ہوں۔
صبح سے دوپہر تو مجھے اسکول میں ہی ہو جاتی ہے اور گھر آکر بھی زیادہ وقت کچن میں
کام کرتے گزر جاتا ہے۔ وہاں کون سا پنکھا چل رہا ہوتا ہے''۔ جگنو کے سر میں شدید
درد ہو رہا تھا۔ لہٰذا آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ آخر اس نے بھی انہیں
کھری کھری سنا دیں۔ وہ سٹپٹا کر رہ گئیں۔

''اس گھر میں رہتی ہو۔ فرض ہے تمہارا کہ اسے چلانے میں اپنا حصہ ڈالو''۔

''بھیا جتنا کماتے ہیں مجھے کمانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مگر آپ تو
مجھے بوجھ سمجھتی ہیں۔ بھائی اگر مجھے سپورٹ کریں گے تو کوئی احسان نہیں کریں گے۔ یہ
فرض ہے ان کا۔ بڑے بھائی ہیں وہ میرے اور بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ ایک
بہن کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے وہ؟ کیوں؟ میں جانتی ہوں آپ نے انہیں ایسا کرنے سے
روک رکھا ہے۔ کتنی خود غرض ہیں آپ۔ اگر میری اسکول کی جاب نہ ہوتی تو آپ تو
مجھے روٹی تک کے طعنے دیتیں ہے نا بھابھی!'' وہ غصے کو ضبط کرنے کے باوجود لہجے کی
تلخی نہ چھپا سکی۔

''دیکھو مجھ سے زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں سمجھیں تم اور تمہاری
شادی تو میں کل کی کرتی آج کردوں۔ مگر کوئی ڈھنگ کا رشتہ تو ملے۔ کسی ایسے
ویسے کنگلے، فقیر سے بیاہ دیا تو لوگ تو مجھے ہی الزام دیں گے ناں کہ بھابھی نے جان
بوجھ کر نند کو کنویں میں دھکا دے دیا۔ تم بھی اگر اسکول کے بجائے کسی دفتر میں نوکری
کر لیتیں تو اب تک کوئی رشتہ کیا ملتا، شادی ہو چکی ہوتی تمہاری وہاں تو مرد بھی کام
کرتے ہیں اور خیر سے اللہ نے تمہیں حسن کی دولت دینے میں تو کمی نہیں چھوڑی۔ تم
تو جسے کہو گی تمہارے پیچھے ہاتھ باندھے چلا آئے گا''۔ ثمینہ بھابھی نے بڑے
طریقے سے بات بنائی۔

''مجھے ایسے گھٹیا حربے آزمانے کا کوئی شوق نہیں ہے اور دفتر کی نوکری میں
سب سے پہلے باس کی خدمت میں اپنی عزت نفس، انا اور خودداری کا استعفیٰ پیش
کرنا ہے۔ تب کوئی لڑکی کسی دفتر میں مردوں کے بھیڑیا نما غول میں ملازمت کرنے
کے قابل ہوتی ہے اور بھابھی! اس گھر میں میرے متعلق جو کچھ کہا، سنا اور کیا جاتا ہے
نا میں اس سے لاعلم ہرگز نہیں ہوں۔ اصل بھائی پہلے میرے بھائی ہیں۔ بس اتنا یاد
رکھیے گا آپ''۔ وہ نہایت سنجیدگی سے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ہونہہ! میں کراؤں گی اس کی شادی۔ اپنے شوہر کی کمائی اس کے جہیز پر
لٹاؤں گی۔ کبھی بھی۔ نہیں بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے ساری [illegible] [illegible] کی دہلیز پر۔ میری

بلا سے اپنا کماتی ہے۔ میرا کیا لے گی؟'' ثمینہ بھابھی نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے شاطرانہ انداز میں سوچا۔

''اوہ!'' جگنو گھر کے قریب ہی پارک میں داخل ہوتے ہی کسی سے ٹکرائی تھی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو محسن رحمان کو اپنے روبرو پایا۔

''آپ یقیناً جگنو ہیں''۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی محسن رحمان کے لب وا ہوئے۔

''جی مسٹر محسن! لیکن آپ نے کیسے پہچانا؟'' جگنو کی حیرت بجا تھی۔

''آپ کے لودیتے وجود کی خوشبو سے کچھ لوگوں کی خوشبو ان کی پہچان ہوتی ہے۔ میں نے بھی آپ کو آپ کی خوشبو سے پہچانا ہے''۔

''آئی ایم سوری! میں پھر آپ سے ٹکرا گئی''۔ وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ شاید ہمارا دوبارہ یوں ٹکرا جانا کسی سبب سے ہو۔ قدرت کسی وجہ سے ہی ہمیں آپس میں ٹکرا رہی ہے''۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا پارک کے اندر آتے ہوئے بولا، تو اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

''ایک اندھا دوسرے اندھے سے ٹکرا جائے، تو اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے''۔ جگنو نے معنی خیز بات کہی تھی۔

''مگر آپ سے ٹکرانے کے بعد مجھے روشنی اور اجالے کا احساس ہونے لگا ہے۔ کوئی جگنو سا ہے جو میری آنکھوں میں چمکا ہے۔ ایک کرن ہے جو میرے دل میں پھوٹ پڑی ہے۔ نور کا ایک ہالہ ہے۔ جس نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میرے من کی آنکھ اور بھی روشن ہو گئی ہے۔ روح کی گرہیں کھل گئی ہیں۔ سوچ کا دریچہ وا ہو گیا ہے۔ آپ تیئس چوبیس برس کی جذبوں کی شدتوں سے بھرپور لڑکی ہیں''۔

''آپ کو میری عمر کا اندازہ کیسے ہوا؟'' اس کی جگنو سی آنکھوں میں حیرت اور آئی اور وہ اس کے ساتھ سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''آپ کے چلنے کی رفتار میں جو جلدی اور تیزی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا

ہے میں نے آپ کی عمر کی اکثر لڑکیاں جلدی جلدی سب کچھ کر لینا چاہتی ہیں۔ سب کچھ حاصل کر لینا چاہتی ہیں۔ میں نابینا سے پہلے بینا تھا۔ میں نے جگنو! زندگی کے سب رنگ دیکھ رکھے ہیں اور ان آنکھوں نے اور جب دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تو معلوم ہوا کہ لوگ صرف روشنی اور اجالے میں ساتھ چلتے ہیں۔ اندھیرے میں ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ کسی کی بیساکھی بنا کسی کو منظور نہیں ہے۔ کوئی کسی دوسرے کو اپنی آنکھیں، اپنی بینائی، اپنی نظر نہیں دے سکتا۔ روشنی کا سہارا کوئی نہیں دینا چاہتا۔ بعض لوگ تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ دیکھنے کا نور ہر آنکھ کو نصیب نہیں ہوتا۔'' محسن رحمان نے سنجیدہ مگر مدھم لہجے میں کہا۔

آپ کو دیکھ نہ سکنے کا ملال نہیں ہوتا؟ آپ کیسے دیکھ لیتے ہیں بغیر بینائی کے؟'' جگنو اس کی باتوں سے اس کی ہمت سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ محسن رحمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مس جگنو! اللہ انسان سے جب کوئی نعمت یا صلاحیت واپس لیتا ہے نا، تو اس کی جگہ اسے کوئی دوسری نعمت یا صلاحیت ودیعت کر دیتا ہے۔ میری باہر کی آنکھ بند ہو گئی تو اندر کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔ باہر اندھیرا چھا گیا تو اندر اجالا۔ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ، زینہ بہ زینہ اترنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے اندر روشنی کا سماں بندھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ باہر ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اندر بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ بس ہم دھیان کم دیتے ہیں۔ اب مجھے کسی باہر والے کو نہ دیکھ سکنے کا ملال نہیں ہوتا۔ جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کو اپنے دل کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہوں''۔

''کیا جگنو کو آپ کے دل کی آنکھ دیکھ رہی ہے''۔

''ہاں۔ مگر اس جگنو کی روشنی مایوسی کے سبب، یا شاید کسی اور وجہ سے ماند پڑ رہی ہے۔ کچھ اپنے بارے میں بتایئے نا مس جگنو؟'' محسن رحمان نے سنجیدگی سے جواب دیا، تو اس نے الف سے ی تک اپنی زندگی کی ساری کہانی جانے کس خیال اور اعتبار پر اسے کہہ سنائی۔

''یہ کارڈ رکھ لیجیے۔ شاید کبھی ضرورت پڑ جائے''۔ محسن رحمان نے اپنی شرٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اسے ہاتھوں سے ٹٹول کر محسوس کر کے اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟'' وہ کارڈ لے کر پوچھنے لگی۔

''ہرگز نہیں۔ آپ تو بہت بہادر اور باہمت لڑکی ہیں۔ آپ کو میں یہ کارڈ اس خیال سے دے رہا ہوں کہ شاید کبھی مجھے آپ کی ضرورت پڑ جائے تو ایسی صورت میں آپ کے پاس میرا ایڈریس تو ہونا چاہیے نا۔ آپ کو میرے آشیانے کا پتہ تو معلوم ہونا چاہیے نا''۔ اس نے وضاحت کی۔

''جہاں آپ ودانہ ہوتا ہے۔ وہاں پرندے خود بخود پہنچ جاتے ہیں۔ بہر حال بہت شکریہ! مجھے آپ سے مل کر آپ سے بات کر کے حقیقتاً بہت ہمت اور مسرت ملی ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے مسکرا کر کہا۔

''شکریہ! میرے احساسات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں''

''اچھا میں چلوں گی اب۔ آپ ابھی یہاں رکیں گے یا چلیں گے؟'' وہ کھڑی ہو گئی۔

''آپ جا رہی ہیں تو میں یہاں رک کر کیا کروں گا؟ میں بھی چلتا ہوں۔ میرا ڈرائیور گاڑی لیے منتظر ہوگا''۔ وہ بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''آیئے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک پہنچا دوں''۔ جگنو نے بے اختیار جذبہ ہمدردی اور خدمت و مدد سے سرشار ہو کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''آپ اندھیرے کا ہاتھ تھامنا چاہتی ہیں؟''

''نہیں۔ میں اپنے اندر کم ہوتی روشنی کو بڑھانا چاہتی ہوں''۔ اس کے ذو معنی جملے پر وہ مسکرا دیا اور جگنو اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کی گاڑی تک چھوڑنے کے بعد اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی۔ اور اس کا دل بے اختیار محسن رحمان کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

''جگنو! کہاں تھیں تم؟ مہمان انتظار کر کے چلے گئے اور تم اب آ رہی ہو؟'' وہ گھر پہنچی تو ثمینہ بھابی نے اُسے دیکھتے ہی آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیوں بھابھی؟ کیا ہوا؟ میں تو پارک تک گئی تھی۔ کون مہمان میرا انتظار کر کے چلے گئے ہیں؟'' جگنو نے حیرانگی سے انہیں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ لوگ تمہارے رشتے کے لیے آئے تھے۔ زبیر نام ہے لڑکے کا، انکم ٹیکس کے محکمے میں بڑی پوسٹ پہ ہے۔ خوب کماتا ہے۔ کار، کوٹھی بھی ہے۔''

''تو وہ کسی کار، کوٹھی والے گھر کی لڑکی کیوں نہیں ڈھونڈتا؟ اپنے لیے اس گھر سے تو اُسے لڑکی کے سوا کچھ ملنے کا نہیں''۔ جگنو نے پانی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اُسے لڑکی کے سوا کچھ چاہیے بھی نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس ذرا دو بچے ہیں۔ اُس کی بیوی تیسرے بچے کی پیدائش کے وقت بچے سمیت انتقال کر گئی تھی وہ بچوں کے لیے ماں اور اپنے لیے بیوی گھر لانا چاہتا ہے۔'' ثمینہ بھابھی نے اُسے دیکھتے ہوئے قدرے جھجکتے ہوئے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''بھابھی! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ جس کو آپ لڑکا کہہ رہی ہیں۔ وہ اصل بھائی سے بھی بڑا ہے عمر میں۔ ایک پکی عمر کے رنڈوے بچوں والے مرد سے آپ مجھے بیاہنا چاہتی ہیں؟ میں کوئی عمر رسیدہ بیوہ یا مطلقہ تو نہیں ہوں خدانخواستہ۔ تیئس برس کی ہوں میں آپ کو میرے لیے یہ رشتہ پسند آیا ہے۔ اس سے پہلے کنوارے اور برسر روزگار لڑکوں کے اچھے سے اچھے رشتے آئے تھے۔ وہ تو آپ رد کرتی رہی ہیں۔ اس رشتے میں کون سے ایسے لعل جڑے ہیں۔ جو آپ مجھے اس گھر سے بے دخل کرنا چاہتی ہیں؟'' جگنو نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اور کیا کسی محلوں میں رہنے والے شہزادے کا رشتہ آئے گا تمہارے لیے؟'' ثمینہ بھابھی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''بھابھی! نہ تو میں شہزادی ہوں اور نہ ہی میں نے کبھی محلوں کے اور کسی شہزادے کے خواب دیکھے ہیں۔ میرے نصیب میں جو ہوگا مجھے مل جائے گا۔ مگر یہ زبیر صاحب میرا نصیب ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتنا مجھے یقین ہے''۔ وہ پر یقین لہجے میں

بولی۔

''سوچ لو۔ اتنا امیر گھر کہیں نہیں ملے گا تمہیں عیش کرو گی عیش۔ مرد کی عمر کون دیکھتا ہے اور اس کے بچوں کے لیے تو ملازمہ موجود ہے۔ تم تو صرف حکم ہی چلاؤ گی اور کھلا خرچ کرو گی۔'' ثمینہ نے دوبارہ قائل کرنا چاہا۔

''پلیز! بھابھی! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ یہ رشتہ اگر اتنا ہی شاندار ہے نا تو آپ اپنی بہن زرینہ کے لیے قبول کر لیں۔ وہ تو مجھ سے عمر میں چار سال بڑی ہیں اور ابھی تک کنواری ہیں۔ ایک منگنی بھی ٹوٹ چکی ہے اُن کی۔ آپ کو اُن کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ بھابھی! میرا اللہ مالک ہے''۔ جگنو نے سنجیدہ مگر نرم لہجے میں کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔

''جگنو صحیح کہہ رہی ہے ثمینہ! یہ رشتہ اگر اتنا ہی اچھا ہے تو تم زرینہ کے لیے سوچو اور رہی بات جگنو کی تو اس کی شادی وہیں ہوگی۔ جہاں اس کی دلی رضامندی شامل ہوگی اور میں اپنی بہن کو خالی ہاتھ بھی نہیں وداع کروں گا۔ جو مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ آج کے بعد تم جگنو سے جلنا چھوڑ دو۔ نفرت اور حسد کی آگ تمہیں جلا ڈالے گی۔ کیا لیتی ہے یہ تم سے؟ کہیں تم زرینہ کی شادی نہ ہو سکنے کا انتقام اس معصوم سے تو نہیں لے رہیں کہ تمہاری بہن بن بیاہی بیٹھی ہے تو نند بھی اپنے گھر کی نہ ہونے پائے۔ ورنہ تمہاری تسلی ہوگی کہ کم عمر نند بیاہی گئی ہے اور بہن کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ وہ شادی کے انتظار میں بیٹھی ہے یوں۔'' ارسل اُن دونوں کی باتیں سن کر وہیں چلے آئے تھے۔

''مجھے کیا ضرورت ہے جگنو سے جلنے کی؟ جس کے نصیب میں جو لکھا ہے وہ اُسے مل جائے گا۔ خواہ وہ جگنو ہو یا زرینہ''۔ ثمینہ بھابھی کے دل کا چور پکڑ لیا تھا ارسل نے۔ وہ نظریں چرا کر بولیں اور اُٹھ کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

''آپ سے ٹکرانے کے بعد مجھے روشنی اور اُجالے کا احساس ہونے لگا ہے''۔

''کچھ لوگوں کی خوشبو اُن کی پہچان ہوتی ہے۔ میں نے بھی آپ کو آپ کی خوشبو سے پہچانا ہے''۔

''قدرت کسی وجہ سے ہی ہمیں آپس میں ٹکرا رہی ہے''۔ جگنو سونے کے لیے لیٹی تو آنکھوں میں محسن رحمان وجیہہ صورت آ سمائی اور سماعتوں میں اُس کا مدھم چہکتا لہجہ پھول بن کر کھلنے لگا۔ اُسے دل کی دھڑکنوں کی لے بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ محسن رحمان چھ فٹ کا لمبا چوڑا، مضبوط جسامت رکھنے والا، وجیہہ مرد تھا۔ کھلی کھلی سُرخی مائل سفید رنگت، دلکش نقوش کا حامل چہرہ، اُس کی آنکھیں بہت سحر انگیز تھیں۔ مگر بینائی کے نور سے محروم تھیں...... قدرت نے اُسے حسن دے کر حسن کو دیکھنے والی آنکھیں بے نور کر دی تھیں۔ مگر وہ کس قدر مطمئن اور مسرور تھا۔ اپنے اس حال میں۔ جگنو کو بے اختیار اُس پر پیار آنے لگا تھا۔ اُس کی نظر میں اُس کی بے نور آنکھوں میں نور تھا۔ وہ مسٹر رحمان کی اسی معذوری سے بے نیاز اُس کے خوابوں کی ایک دنیا اپنی روشن آنکھوں میں بسائے نیند کی وادی میں جا پہنچی۔

''محسن بیٹا! تم سوئے نہیں اب تک؟'' مسز سعدیہ رحمان اُس کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر کمرے میں آئیں تو اُسے ایزی چیئر پر دراز دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

''مما! نیند نہیں آ رہی مجھے''۔

''مگر تم تو روز اس وقت تک سو جاتے ہو۔ ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں بیٹا صبح آفس جانا ہے تمہیں۔ نیند نہ آنے کی ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔ کیا بات ہے میری جان؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' مسز سعدیہ رحمان نے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے متفکر اور حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی مما! میں ٹھیک ہوں''۔

''پھر کیا بات ہے؟''

''مما! جگنو اندھیرے میں ہی چمکتا ہے نا؟
اندھیرے کے لیے ہی ہوتا ہے نا؟''

''ہاں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مما! میں بھی یوں ہی سرراہ چلتے چلتے ایک جگنو سے جا ٹکرایا ہوں۔ مما! کیا وہ

جگنومیری زندگی کے اندھیروں کا ساتھی بن سکتا ہے؟''
محسن رحمان نے دومعنی بات کہی تھی اس کے آس پاس ''جگنوحسین'' کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ ہاتھ اس کے لمس کی حدت سے اب تک لودے رہے تھے۔

''کیوں نہیں بیٹا! جگنوتو ہے ہی اندھیرے کا ساتھی۔ اُجالے میں تو وہ ساتھ نبھاتا ہی ہے۔ لیکن اندھیرے میں اُس کی وفاداری اور جانثاری بے مثال ہوتی ہے۔ محسن بیٹا اب اگر وہ جگنوتم سے ٹکرائے نا تو اُس کا ہاتھ تھام لینا۔ اُسے جانے نہ دینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جگنوتمہاری زندگی کے اندھیرے دور کردے گا۔ انشاء اللہ ۔مسز سعدیہ رحمان نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے یقین سے کہا۔

''تھینک یو' مما!'' محسن رحمان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا اور جگنوکوچشم تصور میں اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھنے لگا بے قراری سی بے قراری تھی۔

جگنوکومحسن رحمان سے محبت ہوگئی تھی اور اُسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ اُس کی محبت اندھی ہے۔ اُس نے سنا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو سچ مچ اسکی محبت اندھی تھی۔ مگر پھر بھی کتنی روشن اور اُجلے دل کی مالک تھی۔ اس کے لیے یہ احساس ہی بہت خوش کن تھا کہ اُس نے جس شخص سے محبت کی ہے۔ وہ ایک مہذب، سلجھا ہوا باحیااور تعلیم یافتہ انسان تھا۔ اُس کا نرم، دھیما لہجہ جگنو کے کانوں میں رس گھولتا رہتا تھا۔ وہ پارک میں کئی بار گئی۔ مگرمحسن رحمان وہاں دوبارہ نہیں آیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دیئے ہوئے وزٹنگ کارڈ پر درج نمبرز پر اُسے فون تک نہیں کرسکی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ جگنواُس کی دولت سے مرعوب ہو کر اُس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جب کہ وہ تو محبت میں محسن رحمان کی طرف بے اختیار بڑھتی چلی جارہی تھی۔ آنکھیں دن رات اُس کے سپنوں کی بارات سجائے رکھتی تھیں۔

اُدھرمحسن رحمان اسکول سے جگنوکے گھر کا ایڈریس معلوم کرنے کے باوجود لاکھ چاہنے کے باوجود اُس سے رابطہ کرنے سے گریزاں رہا۔ اُسے اپنی یہ خواہش، بے کلی اور عاشقی خودغرضی پر منحصر محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ یہ سوچ کر جگنو سے رابطہ نہیں کررہا تھا کہ وہ ایک نابینا شخص ہے۔ وہ اپنی خوشی کی خاطر ایک لڑکی کی زندگی

اندھیروں کی نظر کیوں کرے؟

''جگنو! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں''۔ بالآخرمحسن رحمان کے دل نے اُسے جگنو سے رابطہ کرنے پر مجبور کردیا اور اُس نے جگنوکوفون کرکے کہا۔ وہ تو جیسے اُس کی طرف سے اسی پیغام کی منتظر تھی۔ خوشی سے دل کوتھام کر پوچھا۔

''کب کہاں؟''

''اُسی پارک میں جہاں آپ اور میں دوسری بار ٹکرائے تھے۔ اُسی وقت آج شام میں آپ کا منتظر رہوں گا جگنو!''

''میں ضرور آؤں گی''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''خداحافظ''۔ محسن رحمان نے خوش ہوکرفون بند کردیا اور جگنوکی آنکھیں سچ مچ جگنوکی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے شام کو پہننے کے لیے ہلکے گلابی اور سفید رنگ کے کاٹن نیٹ کے شلوار سوٹ کا انتخاب کیا تھا اور شام تک کا وقت اُس نے بڑی بے تابی سے کاٹا تھا۔ وہ یوں تیار ہوئی تھی جیسے محسن رحمان اُسے دیکھ سکتا ہو۔ اپنی رنگت سے میل کھاتا گلابی رنگ پہن کر اُس نے ہونٹوں پر ہلکی سی گلابی لپ اسٹک لگائی۔ جگنو ساڑھے پانچ فٹ کی بھری بھری جسامت کی مالک تھی۔ حسن وہ دلکشی میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں ایک تھی۔ سادہ مزاج، سادہ لباس اور مثبت سوچ کی حامل جگنو نے کبھی اپنی خوبصورتی کو کیش کرانے کا نہیں سوچا تھا۔ پہلی بار اُس کے دل میں محبت سے لطیف جذبے نے سراُٹھایا تھا اور اُس نے سرتسلیم خم کرتے ہوئے اس کے ہررنگ کوقبول کرلیا تھا۔

وہ پارک میں پہنچی تومحسن رحمان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اُسی سنگی بنچ پر بیٹھا تھا۔ جس پر چندروز پہلے وہ دونوں بیٹھے سے تھے۔ باتیں کرتے رہے تھے۔ سفید جینز کی پینٹ اور کرسٹل گرین شرٹ میں وہ بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کے قریب بنچ پر اُس کی سفید چھڑی رکھی ہوئی تھی۔ جگنو خاموشی سے دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے برابر آبیٹھی۔

''تھینک یو! جگنو! آپ نے یہاں آکرمیرے لفظوں اور جذبوں کا مان رکھ

لیا''۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ہی آئی ہوں؟'' اُس نے حیرانگی سے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

''آپ کی خوشبو سے اور آپ کے قدموں کی آہٹ میں نے اپنے دل کے کانوں سے سن لی تھی''۔

''اچھا''۔ وہ ہنس پڑی اور سرشار بھی ہوگئی تھی کہ وہ اُسے محسوس کرنے کی حد تک چاہنے لگا ہے یا دل خوش فہم ہو رہا تھا شاید۔

''آپ نے مجھے فون کر کے یہاں بلایا ہے؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''جی ہاں...... بہت ہی خاص بات ہے''۔

''کیا؟''

''جگنو! میں نے یہ تحفہ آپ کے لیے خریدا ہے۔ آپ کو پسند آجائے تو پلیز قبول کر لیجیے۔'' محسن رحمان نے اپنی پینٹ کی جیب میں سے ایک سرخ مخملی ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو جگنو نے تیز تیز دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھ کے ساتھ وہ ڈبیہ اُس کے ہاتھ سے لی اور گھبراتے ہوئے ڈبیہ کھولی۔ اُس میں ہیرے کی بہت نفیس انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ جگنو کا دل ایک لمحے کو تو دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔

''کیا میری قسمت جگمگانے والی ہے؟ کیا میں اس لائق ہوں کہ اتنے خوبصورت اور خوب سیرت شخص کی شریک حیات بن سکوں؟ کیا یہ ہیرے جیسا شخص میرے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے؟'' جگنو کے اندر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

''محسن صاحب! یہ تو انگوٹھی ہے''۔

''جی مس جگنو اور آپ جانتی ہیں ناں کہ کوئی لڑکا اگر کسی لڑکی کو انگوٹھی تحفے میں دیتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''جی''۔

''تو آپ میرا یہ تحفہ قبول کرنے یا نہ کرنے کا پورا حق رکھتی ہیں''۔ محسن

رحمان نے بہت نرم اور مہذب لہجے میں کہا۔

''آپ نے یہ انگوٹھی مجھے ہی کیوں دی ہے؟''

''آپ کے سوا دل کسی اور کو لائق ہی نہیں سمجھتا''۔

محسن رحمان نے ایمانداری سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں اگر آپ مجھے اپنے لائق اپنے قابل نہیں سمجھتی تو......''

''نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں ہے''۔ وہ فوراً اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔

''گویا آپ کو یہ انگوٹھی قبول ہے''۔ وہ مسرور ہو کر بولا۔

''جی ہاں۔ مگر میری ایک شرط ہے''۔ وہ شرطیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''کہیے؟''

''یہ انگوٹھی آپ خود مجھے اپنے ہاتھ سے پہنا دیجیے''۔

''ضرور۔ کیوں نہیں۔ لائیے اپنا ہاتھ اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں۔'' وہ خوشی سے ہنس کر بولا تو اُس نے انگوٹھی اور ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''آپ اندھے نہیں ہیں محسن!'' وہ محبت سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں اب مجھے روشنی کا سہارا مل گیا ہے۔ نور کی کرن نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔ میری دو آنکھیں اب آپ ہیں جگنو! میں واقعی اندھا نہیں رہا۔ اب تو میری زندگی میں جگنو آ گیا ہے''۔ محسن رحمان اس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا کر، اس کا ہاتھ تھامے جذباتی لہجے میں بولا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔

''جگنو آ گیا ہے نہیں محسن! جگنو آ گئی ہے۔'' جگنو نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے تصیح کرتے ہوئے کہا۔

''اولیں'' وہ خوش دلی سے ہنس پڑا۔ جگنو بھی اپنی محبت کا ہاتھ تھامے زندگی کے اس نئے سفر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بہت مطمئن اور مسرور دکھائی دے رہی تھی کہ اس کے چاروں طرف محبت کے جگنو رقص کرتے اُڑتے پھر رہے تھے۔

☆☆☆

عید کا چاند

"ماہم اپنا سامان سمیٹو میں تمہیں ابھی تمہارے ماں باپ کے گھر چھوڑ کر آؤں گا"۔ حبیب دفتر سے گھر آیا تو اسے دیکھتے ہی غصیلے لہجے میں بولا۔

"مگر کس لیے؟" ماہم اس کے لب و لہجے اور انداز پر حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"اس لیے کہ میں تمہیں عید پر ڈائمنڈ کا سیٹ تحفے میں نہیں دے سکتا۔"

"تو میں نے کب فرمائش کی ہے آپ سے ڈائمنڈ کے سیٹ کی؟" اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"مجھ سے فرمائش نہیں کی مگر اپنی دوست سے تو اپنے دل کی بات کہی ہے نا اور اسے میری حیثیت بھی بتائی ہے تم اپنا من مار کر یہاں رہ رہی ہو نا"۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا"۔

"تمہاری دوست عالیہ آئی تھی نا آج۔" وہ اس کے سامنے کھڑا شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو اس نے کہا۔

"جی آئی تو تھی"۔

"تو کیا تم نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ میرے شوہر کی اتنی حیثیت کہاں کہ وہ مجھے عید پر ڈائمنڈ کا سیٹ تحفے میں دے سکے۔ یہاں تو ایک ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ اب کی بار اگر مجھے میری پسند کا تحفہ نہ ملا تو میں بھی میکے چلی جاؤں گی دل گھٹتا ہے میرا اس ڈربے نما فلیٹ میں، بولو کیا تم نے یہ سب نہیں کہا تھا؟"

"نہیں آپ سے کسی نے جھوٹ بولا ہے"۔

"مجھ سے کسی نے جھوٹ نہیں بولا تمہاری دوست مجھے گفٹ سینٹر پر ملی تھی کہنے لگی حبیب بھائی آپ ماہم کے لیے ڈائمنڈ سیٹ خریدنے کی کوشش کریں ورنہ وہ ناراض ہو کر میکے چلی جائے گی۔ تم کیا ناراض ہو کر میکے جاؤ گی میں خود ہی تمہیں میکے چھوڑ آؤں گا اٹھاؤ اپنا سامان"۔ وہ سخت غصیلے لہجے میں کہہ رہا تھا ماہم کے تو پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ اس نے تو عالیہ سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر اس نے کون سی دشمنی نکالی تھی اس سے اسے ایک دم سے عالیہ سے نفرت ہونے لگی۔ اس کی حاسد طبیعت اور لگائی بجھائی کی عادت کا اسے علم تو تھا مگر چونکہ خود کبھی اس کی زد میں نہیں آئی تھی اس لیے کبھی نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ اب خود پر ضرب پڑی تھی تو تڑپ اٹھی تھی۔

"حبیب پلیز ایسا مت کریں آپ میری بات تو سنیں میں نے ایسا کچھ نہیں کہا"۔

"تو کیا تمہاری دوست جھوٹ بول رہی تھی؟" وہ غرایا۔

"آپ کو میرا اعتبار کرنا چاہیے میری دوست کی باتوں کا نہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"انسان اپنے دوست سے ہی پہچانا جاتا ہے ظاہر ہے جیسی تم ہو ویسی ہی تمہاری دوست ہو گی اور میں نے تو اعتبار کیا ہے اس کی باتوں پر"۔

"لیکن ...... حبیب؟"

"بس" حبیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔

"میں ایک لفظ نہیں سنوں گا میری جو بھی حیثیت ہے مجھے فخر ہے اس پر میں دس ہزار روپے ماہوار کماتا ہوں اس پر تمہاری ناشکری نہیں جاتی۔ تم جاؤ اپنے میکے تمہارے باپ اور بھائی کی تو ملیں چلتی ہیں وہ تو اس سے بیس لاکھ روپے ماہوار کماتے ہوں گے۔ جاؤ وہاں جا کر اپنی ڈائمنڈ سیٹ کی خواہش پوری کرو۔ تم نے اپنی دوست کے سامنے میری انسلٹ کی ہے میں یہ گستاخی ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ چلو جاؤ سامان چیک کرواؤ اپنا۔"

''حبیب ....؟''

''شٹ اپ''۔ وہ اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا غصے سے بولا اور خود ہی اس کا سوٹ کیس اٹھا لایا اور وارڈ روب میں اس کے کپڑے نکال نکال کر اس میں ٹھونسنے لگا۔ وہ کھڑی روتی رہی تو وہ غصے سے بولا۔

''میں تمہارا ملازم نہیں ہوں کہ تمہارے کام کروں خود رکھو اپنی چیزیں اور دس منٹ میں باہر آؤ''۔

''وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ ماہم نے روتے ہوئے اپنی ضرورت کی ساری چیزیں سوٹ کیس میں رکھیں اور باہر آ گئی۔ وہ اپنی پرانے ماڈل کی سوزوکی مہران میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بھاری سوٹ کیس اٹھا کر لا رہی تھی اسے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بڑھ کر سوٹ کیس ہی اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔

ماہم کو اس کی بات یاد آ گئی۔ چار ماہ پہلے جب وہ ہنی مون کے لیے اسلام آباد جا رہے تھے تو وہ اپنا سوٹ کیس خود اٹھا کر گاڑی تک لا رہی تھی۔ تبھی حبیب نے روڈ کراس کر کے ہاتھ سے سوٹ کیس لیتے ہوئے پیار سے کہا تھا اور وہ شرما گئی تھی اور اسوقت یہ بات یاد کرتے ہوئے اسے رونا آ رہا تھا مگر ضبط کر رہی تھی۔

پیچھے بیٹھو اپنی بلند حیثیت کا خیال کرو میرے ساتھ بیٹھنے سے تمہاری شان میں کمی آ جائے گی۔'' وہ سوٹ کیس ڈگی میں رکھ کر فرنٹ ڈور کھولنے لگی تو اس نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا تو اس نے ابھی بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''کچھ نہیں سنوں گا بیٹھو فوراً میں ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا''۔ اور ماہم آنسو بہاتی خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ حبیب نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ آج تیسرا روزہ تھا ان دونوں نے اپنی شادی کی پہلی عید بہت اہتمام سے منانے کا پروگرام بنایا تھا اور یہاں تو آغاز ہی برا ہو گیا تھا۔ سارے راستے دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ماہم روتی رہی اور وہ جو اس کی آنکھوں میں ایک آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا بے کل اور بے قرار ہو جاتا تھا اب سنگدلی سے اسے روتے دیکھ رہا

تھا۔ ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ ماہم کے ڈیڈی کا بنگلہ آیا تو وہ اسے وہیں اتار کر چلا گیا۔ وہ اپنے آنسو صاف کر کے سوٹ کیس اٹھا کر گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ سب گھر والے اس کے ماموں کے گھر افطار پارٹی میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے کمرے میں آ گئی پہلے تو جی بھر کے روئی اور پھر وضو کر کے باہر آ گئی۔ روزہ کھلتے ہی دعا مانگی روزہ افطار کیا مغرب کی نماز ادا کی اور ہلکا سا میک اپ کر کے خود کو گھر والوں کے سامنے خوشگوار موڈ میں جانے کے لیے تیار کرنے لگی۔ عشا کے بعد ممی ڈیڈی، رضوان بھائی اور سمیرا بھابی گھر آئے تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''حبیب نہیں آیا کیا؟'' ممی نے پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

''ممی وہ آئے تھے مجھے چھوڑ کر چلے گئے کافی دیر آپ لوگوں کا انتظار کیا تھا۔ میں کچھ دن یہیں رہوں گی۔ دراصل انہیں کمپنی کے کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا ہے۔ میں وہاں اکیلی ہو جاتی۔ ابو بھی اپنی بیٹی سے ملنے جا رہی تھیں اس لیے وہ مجھے یہاں چھوڑ گئے۔''

''یہ تو اچھا کیا حبیب نے''۔ ممی نے مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے ممی کہ حبیب نے اچھا کیا یا برا کیا۔'' اس نے دل میں کہا۔

''ہاں بھئی بہت دن ہو گئے تھے تم سے لمبی چوڑی گپ شپ نہیں لگی تھی اب مزا آئے گا خوب محفل جمے گی ورنہ شادی کے بعد تو تم میاں کی ہی ہو کر رہ گئی ہو۔'' رضوان بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ بھی تو بیوی کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں''۔ ماہم نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا تو سب ہنس پڑے۔

رضوان بھائی اور ماہم کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ سمیرا بھابی ممی کے اکلوتے بھائی کی بیٹی تھی اور حبیب ڈیڈی کے بہت پرانے اور عزیز دوست منیب صاحب کا بیٹا

تھا۔ الیکٹریکل انجینئر تھا اور ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ ماہم کو اس نے کئی بار دیکھا تھا وہ اکثر ڈیڈ سے ملنے یا رضوان بھائی سے ملنے آتا رہتا تھا۔ ماہم سے اس نے زبان سے تو کبھی کچھ نہیں کہا تھا مگر وہ دونوں ایک دوسرے کو دل ہی دل میں چاہنے لگے تھے۔ ان کے لب تو اظہار نہیں کرتے تھے مگر آنکھیں خوب بولتی تھیں۔ ان کے دل کے بھید عیاں کرتی رہتی تھیں۔

منیب صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ حسیب ان کی واحد اولاد تھا۔ منیب صاحب بھی پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ کنبہ چونکہ بڑا نہیں تھا اس لیے کبھی بڑا گھر بنانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ جب حسیب اور ماہم کی شادی کی بات چلی تو انہوں نے اپنے ڈیفنس والے پلاٹ پر ان کے لیے ولا بنانے کا کام شروع کرا دیا۔ حسیب بھی اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے وہاں جاتا رہتا تھا۔ ماہم اور اس کے گھر والوں سے یہ بات پوشیدہ تھی۔ وہ انہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ اپنا پرانا فلیٹ انہوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا اور کمپنی کی طرف سے ملنے والے فلیٹ میں آج کل رہائش پذیر تھے۔ منیب صاحب عمرہ کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئے تھے وہاں ان کے بہنوئی بھی کئی سالوں سے مقیم تھے۔ انہوں نے ہی منیب صاحب کو روک لیا تھا۔ یوں حسیب اور ماہم اکیلے ہی تھے دونوں گھر میں، آج بھی حسیب دفتر سے واپسی پر حسیب گفٹ سینٹر ماہم کے لیے گفٹ خریدنے کی غرض سے گیا تھا کہ اتفاق سے عالیہ بھی اسے وہاں مل گئی اور اس نے ماہم کی باتوں کو اپنے طریقے سے مرچ مسالہ لگا کر اس کے سامنے پیش کیا جس نے فوری اثر دکھایا اور حسیب اس کی باتوں پر سیخ پا ہو کر گھر پہنچا اور ماہم کی شامت آ گئی۔

ماہم نے دوسرے دن حسیب کو فون کیا مگر اس نے اس کی آواز سنتے ہی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور ماہم کو حسیب سے ایسی بے حسی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی باتیں تو کہہ دیں تھیں مگر اس کی ایک نہیں سنی تھی اور بنا کسی جرم کے اسے سزا دے کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے آنسو سب سے چھپاتی ہوئی اسٹڈی روم میں آ گئی۔ جہاں شادی سے پہلے اس کا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے، کمپیوٹر گیمز کھیلنے، پیٹنگ

کرنے، ویب سائٹس بنانے اور سی ڈی وغیرہ دیکھنے سننے میں گزرتا تھا۔ کمپیوٹر کو دیکھ کر اس کا پرانا شوق پھر سے جاگ اٹھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ حسیب کے پاس بھی کمپیوٹر تھا اور وہ اکثر شام بیٹھا ہوتا تھا اس پر۔ اس نے ماہم کو بھی ویب سائٹ بنا کر دی تھی اس کا نیا پاس ورڈ اور نک اسی نے تجویز کیا تھا۔ وہ اکثر اسے پیار سے چندا کہتا تھا اور ماہم بھی کبھار چندا کے نک سے ہی پیٹنگ کرتی تھی۔ حسیب کے ہوتے ہوئے اسے پیٹنگ کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی تھی لیکن اسے وقت وہ اس کے پاس نہیں تھا اس کی تلخ، طنزیہ اور غصیلی باتیں اسے بے قرار کر رہی تھیں جس سے دھیان ہٹانے کی خاطر اس نے پیٹنگ کرنے کا ارادہ کیا اور کمپیوٹر آن کر لیا۔

تھوڑی دیر سرچ کرنے کے بعد اس کے مسیج پر جواب آیا Lover کے نک سے ایک لڑکی آن لائن تھی۔ پہلے تو ماہم کو اس کا نک بہت عجیب لگا ہنسی بھی آئی مگر چونکہ اور کوئی آن لائن نہیں تھا سو مجبوراً اس سے پیٹ کرنا شروع کر دی۔

"آپ نے اپنا نک اور کیوں کر رکھا ہے؟" ماہم نے پہلا سوال پوچھا۔

"کیونکہ میں اور ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

"کس کی؟" ماہم نے مسکراتے ہوئے کی بورڈ کے بٹن دبائے۔

"اپنے شریک زندگی کی"۔ اس کا جواب آیا۔

"تو اس وقت آپ کے شریک زندگی کہاں ہیں جو آپ رات گئے گیارہ بجے بہت اطمینان سے چیٹنگ کر رہی ہیں؟" ماہم کا اگلا سوال تھا۔

"وہ بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں ابھی ان ہی سے چیٹ کر کے فارغ ہوئی تھی کہ آپ سامنے آ گئیں۔ آپ کا نک بہت خوبصورت ہے چندا کس نے رکھا ہے نک؟"

"میرے ہسبنڈ نے"۔ ماہم نے افسردگی سے جواب پریس کیا۔

"کیا آپ چندا جیسی روشن اور پیاری ہیں؟"

"وہ تو یہی کہتے ہیں"۔ اس نے جواب دیا آنکھیں بھیگنے لگیں تھیں۔

"تو آپ کے "وہ" اس وقت کہاں ہیں جو آپ رات کے گیارہ بجے اطمینان

سے چیٹنگ کر رہی ہیں''۔ اور نے اُسی کا سوال دہرایا تھا۔
''وہ..........؟'' ماہم نے بٹن دبایا آگے اس کی انگلیوں کی حرکت تھم گئی اور
اس نے چیٹنگ کا سلسلہ منقطع کر دیا اور کرسی کی پشت سے سر لگا کر سلسلہ منقطع کر دیا اور
کرسی کی پشت سے سر لگا کر دبی دبی سسکیوں سے رونے لگی۔
دو دن تک وہ کمپیوٹر کے قریب بھی نہیں گئی آج چھٹی تھی وہ فجر کی نماز کے بعد سو
نہیں سکی تھی باقی سب گھر والے چھٹی کی وجہ سے مزے سے سو رہے تھے۔ وہ بالوں
میں برش پھیر کر منہ ہاتھ دھو کر اسٹڈی میں آ گئی۔ ایک گھنٹہ اس نے قرآن پاک
پڑھا اور پھر کمپیوٹر کے سامنے آ بیٹھی۔ کمپیوٹر آن کیا تو اور فرینڈ سے بات کرنے کی
کوشش کی تھوڑی دیر میں وہ آن لائن تھی۔ سلام دعا کے بعد اس نے اس سے یہی
پوچھا۔
''آپ نے اس روز چیٹنگ کیوں ختم کر دی تھی بتا بتائیے؟''
''بس یونہی آپ کے شوہر کب واپس آ رہے ہیں؟'' اس نے موضوع بدلنے
کی کوشش کی۔
''عید سے پہلے آ جائیں گے پانچ سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو ہم ہر عید
اپنی شادی کی پہلی عید کی طرح بہت اہتمام سے مناتے ہیں''۔ اور نے اسکرین پر لکھ
کر بھیجا تو ماہم کا دل بجھ گیا۔ اس نے صرف اتنا لکھا۔
''میری شادی کو تو ابھی پانچ ماہ بھی نہیں ہوئے۔''
''اوہ ...... تو اس کا مطلب ہے یہ تمہاری شادی کی پہلی عید ہے تیاریاں تو
خوب ہو رہی ہوں گی''۔
''پتا نہیں''۔ ماہم نے افسردگی سے بٹن پریس کیے۔
''کیوں بھئی یہ کیا بات ہے پہلی عید تو بہت یادگار رہتی ہے اور چندا اگر آپ کو
برا نہ لگے تو مجھے اپنا مسئلہ بتائیں شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں کیونکہ مجھے محسوس
ہو رہا ہے کہ آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ میرا پانچ سالہ تجربہ شاید آپ کی پریشانی
کا کوئی حل نکال سکے پلیز بتایئے نا اپنی دوست اور بڑی بہن سمجھ کر بتا دیں''۔ اور

نے اتنے اپنائیت بھرے انداز سے پوچھا تو وہ چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اسے
ساری بات تفصیل سے ___ دی۔
''اوہ ویری سیڈ یہ تو بہت برا ہوا، بہت برا کیا آپ کی دوست نے اور آپ
کے شوہر نے آپ کے ساتھ۔ آپ نے اپنے شوہر کو فون تو کرنا تھا بات کلیئر کرنی
تھی''۔ اور نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے رائے دی۔
''میں نے فون کیا تھا مگر انہوں نے میری آواز سن کر فون بند کر دیا۔ ایک تو
غلطی بھی ان کی ہے اور اوپر سے ناراض بھی ہیں۔ مجھے خود گھر کے باہر چھوڑ کر گئے۔
میرا فون سنتے ہی ریسیو پٹخ دیا گیا ہے مجھے، میں تو کبھی زیورات کی دلدادہ نہیں
رہی اور ڈائمنڈ سیٹ بھی۔ مجھے بھائی جان نے میری شادی پر گفٹ کر دیا تھا۔ مجھے
اس کی بھی خواہش نہیں تھی لیکن حسیب نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیا سارے
شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں؟ شادی کے شروع کے دنوں میں واری صدقے جاتے ہیں
اور پھر ذرا سی بات پر بیوی کو اس کے جذبات، احساسات اور اعتماد کو توڑ ڈالتے
ہیں۔ کہتے تھے کہ میں تو تمہارے بغیر آفس میں ایک گھنٹہ بھی بہت مشکل سے گزار پاتا
ہوں اور دن تو قیامت بن کر گزرتا ہے اور اب ...... ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہے مجھ پر
قیامت ڈھا کر خود کیسے پرسکون بیٹھے ہیں۔ ایک فون تک نہیں کیا جس سے ظاہر ہے
کہ انہیں میرا نہیں عالیہ کا اعتبار ہے۔ عالیہ سے میں نے دوستی ختم کر دی ہے مگر میں
اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ اس کی لگائی ہوئی آگ میرے دامن تک آ پہنچی
ہے اس طرح تو اسے خوشی ہو گی نا''۔ اس نے بہت تفصیل سے اپنے دل کی بھڑاس
نکالی۔
''تم ناراض ہو اپنے شوہر سے؟'' اس نے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔
''آپ کے خیال میں مجھے ان کے اس رویے پر خوش ہونا چاہیے کیا؟''
''نہیں لیکن پریشان بھی مت ہونا مجھے یقین ہے کہ جیسے ہی انہیں اپنی غلطی کا
احساس ہو گا وہ تمہیں منانے آ جائیں گے اور تم یہ عید اپنے شوہر کے سنگ مناؤ گی''۔
''آپ کے منہ میں شیر خورمہ۔'' ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا تو نور کی ہنسی کا

ایکسپریشن اسکرین پر آیا۔ پھر اس نے سوال کیا۔

''کیا تم نے اپنے گھر والوں کو ابھی تک نہیں بتایا اپنے شوہر کے سلوک سے متعلق''۔

''نہیں دوست میں نہیں چاہتی کہ جب حقیقت میرے شوہر پر عیاں ہو تو وہ سب کے سامنے شرمندہ ہوں، میرے گھر والے مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں انہیں اس واقعے کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی تو سمجھیں حبیب کی شامت آ گئی۔ سب کے دلوں میں ان کے لیے جو محبت اور عزت ہے وہ غصے میں بدلتے نہیں دیکھنا چاہتی میں۔ آخر کو وہ میرے شوہر ہیں انہیں میرا نہ سہی مگر مجھے تو ان کا خیال ہے نا۔ محبت میں یہی تو بڑی مصیبت ہوتی ہے کہ ہمیں اپنے محبوب کی زیادتیوں کو چھپانا، نظر انداز کرنا اور سہنا پڑتا ہے۔'' ماہم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''لگتا ہے بہت چاہتی ہو تم اپنے شوہر کو''۔ اور نے لکھا۔

''ہاں اچھا یہ بتائیں عید کی شاپنگ کر لی آپ نے بچے کتنے ہیں آپ کے؟'' ماہم نے موضوع بدلا۔

''عید کی شاپنگ دو ایک روز میں کروں گی یہ بتاؤ تمہارے لیے عیدی بھیجوں اب تو تم میری دوست بن گئی ہو''۔ اور نے بچوں کے سوال کو گول کر دیا۔

''بہت شکریہ لیکن حبیب کی ناراضگی کی وجہ سے میرا عید کی شاپنگ کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ بس آپ عید کے دن مجھ سے ملنے آ جایئے گا''۔ ماہم نے جواباً لکھا۔

''عید کے دن کیا میں تو چاند رات کو بھی تمہیں ملنے آ سکتی ہوں۔ چاند رات کا مزا ہی اور ہوتا ہے بتاؤ کیا لے کر آؤں تمہارے لیے کانچ کی چوڑیاں، مہندی، مٹھائی، خوشبو اور''۔

''اور بند کلیوں کے ہار اور تازہ پھولوں کے گجرے''۔ ماہم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میسج بھیج دیا۔

''چلو ٹھیک ہے میں یہ سب چیزیں لے کر آؤں گی''۔ اور نے جواب دیا۔

''مگر یہ سب چیزیں تو حبیب کو لے کر آنی چاہئیں۔ وہ جانتے ہی نہیں ہیں مجھے میں تو پھولوں کے ہار سے کلیوں کے گجروں سے خوش ہو جانے والی لڑکی ہوں۔ کاش انہوں نے مجھے سمجھا ہوتا''۔ ماہم نے تاسف اور حسرت سے کی بورڈ کے بٹن د ٭ ے اور سر پکڑ ٭ بیٹھ گئی۔

''تم ایک بار انہیں فون کر کے دیکھو ہو سکتا ہے اس بار انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو''۔ لور نے تحریر کیا تو اس نے دل کو مضبوط بناتے ہوئے جواب دیا۔

''انہیں اگر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو تب میں انہیں فون نہیں کروں گی۔ انہیں خود آنا چاہیے مجھے منانے اور لینے کے لیے چھوڑ کر بھی تو وہ خود ہی گئے تھے''۔

''او کے پھر بات ہو گی ٹیک کیئر چند اڈیر بائے''۔ لور نے آخری پیغام بھیجا تو اس نے بھی خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دن اور رات کے فارغ اوقات میں ماہم اب اکثر اپنی انٹرنیٹ فرینڈ سے چیٹنگ کرتے گزارتی۔ ماہم کی اور اس کی عادات پسند ناپسند بہت ملتی جلتی تھی۔ ماہم بھی اس سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرنے لگی تھی۔ لو نے اسے اپنی عید کی شاپنگ کے متعلق بتایا تھا کہ اس نے کیا کچھ خریدا تھا۔ چار بہ ٭ زبردست سوٹ سلوائے تھے اس نے عید کے لیے ٭یچنگ چوڑیاں، جیولری، جو ٭ پرفیوم وغیرہ اور ماہم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے دعاؤں سے نوازا اور اداس دل کے ساتھ چیٹنگ ختم کر دی کیونکہ یہ وقت رضوان بھائی اور ڈیڈی کے گھر آنے کا تھا۔

''حبیب آپ کب آئیں گے؟'' اس نے کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر دل میں اسے مخاطب کیا۔

''ہیلو...... ہیلو کہاں ہو ماہم؟'' رضوان بھائی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ سمیرا بھابی کے ساتھ اسٹڈی میں موجود تھے۔ ماہم نے اپنے چہرے کے تاثرات خوشگوار بنا لیے۔

''یہیں ہوں''۔ وہ مسکراتے ہو ٭ بولی۔

''تم یہاں ہوتے ہوئے بھی یہاں نہیں ہو بلکہ کہیں اور ہی پہنچی ہوتی ہو''۔ سمیرا بھابی نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس کر بولی۔

''اچھا مثلاً کہاں ہوتی ہوں؟''

''حسیب بھائی کے خیالوں میں ان کی سوچوں میں ان کے دل میں''۔ سمیرا بھابی نے اس کے کان میں شریر لہجے میں سرگوشی کی تو وہ ہنس پڑی۔ دل کے درد کو اس ہنسی میں ہی تو چھپانا تھا۔

''آپ اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہی ہیں ناں''۔ ماہم نے شرارت سے کہا۔

''ماہم بہت شریر ہو تم''۔ سمیرا بھابی شرما گئیں تو وہ ہنسنے لگی۔

''یہ نند بھاوج میں کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں جو ہنسی کے فوارے ابل رہے ہیں''۔ رضوان بھائی نے بک شیلف میں کتابیں رکھنے کے بعد ان کے پاس آ کر پوچھا۔

''ہے کوئی بات آپ کو کیوں بتائیں؟'' ماہم نے سمیرا بھابی کے حیا سے گلنار ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بڑی ادا سے کہا تو وہ ہنس کر بولے۔

''چلو یہ تو بتا دو کہ تم دن رات کس سے چیٹنگ کرتے ہو؟''

''میں...... وہ؟'' وہ اتنا کہہ کر جانے کیوں خاموش ہو گئی۔

''میں بتاتی ہوں۔'' سمیرا بھابی اس کی خاموشی کو سمجھ کر شوخی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

''یہ حسیب بھائی سے چیٹنگ کرتی ہے کیوں ماہم میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''جی''۔ وہ انکار نہ کر سکی شرمیلے پن سے مسکرا دی۔

''اوہ تو یہ بات ہے جبھی یہ کمپیوٹر صاحب آپ کو اتنے پیارے ہو گئے ہیں''۔ رضوان بھائی نے ہنس کر کہا تو وہ فوراً بولی۔

''پیارے تو مجھے آپ بھی ہیں''۔

''ہوں تو پھر چلو اپنے پیارے بھائی کے لیے اچھی سی فروٹ چاٹ بناؤ تمہاری ہاتھ کی بنی فروٹ چاٹ افطار کا لطف دوبالا کر دیتی ہے اور ہاں روزہ کھولنے اور نماز

سے فارغ ہونے کے بعد ہم بازار بھی جائیں گے عید کی شاپنگ کے لیے تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی تیار رہنا''۔ رضوان بھائی نے مسکراتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''بھائی جان آپ بھابی کو ہی لے جائیے گا''۔

''تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی سمجھیں۔'' سمیرا بھابی نے پیار بھری دھمکی دی۔

''تو وہ شرارت سے ہنس پڑی۔ ان دونوں کو بھی ہنسی آ گئی۔

افطار اور نماز سے فارغ ہو کر وہ ان کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی مگر دل بجھا بجھا ہی رہا۔ حسیب کی ناراضگی، غصہ اور بے اعتباری اسے ہر وقت اندر ہی اندر بے کل و بے قرار کیے رکھتی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ بھابی یا بھائی جان کو بتا دے مگر بتانے کی ہمت نہ کر سکی وہ اپنی وجہ سے سب کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آج ستائیسواں روزہ تھا۔ رات بھر عبادت کا پروگرام تھا۔ ان سب کا۔ رضوان بھائی شام کو گھر آئے تو انہوں نے ماہم کو دیکھتے ہی کہا۔

''ماہم حسیب تو اسلام آباد سے آ چکا ہے میری آج ہی اس سے ملاقات ہوئی ہے شاید تمہارے لیے گفٹ خریدنے گیا تھا وہ گفٹ سینٹر وہیں ملا تھا کب لینے آ رہا ہے تمہیں؟''

''جب ان کا دل چاہے گا''۔ ماہم نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تو کیا ابھی تک اس کا دل نہیں چاہا؟'' بھابی نے مذاق سے کہا۔

''ان کے دل کی بات میں کیا جانوں''۔ وہ سٹپٹا کر بولی۔

''تو اور کون جانے گا نند جی''۔ سمیرا بھابی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر شوخی سے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ بمشکل مسکرا پائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ کر آ رہے تھے۔

''الصبح فون تو آیا تھا ان کا مجھے نہیں بتایا انہوں نے کہ یہاں سے بول رہے

ہیں میں تو یہی سمجھی کہ اسلام آباد سے بات کر رہے ہیں''۔ اس نے فوراً بڑی مہارت سے جھوٹ بولا۔

''تو گویا آواز تمہیں دل کے اتنے قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی کہ تمہیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ اسلام آباد سے بول رہے ہیں یا کراچی سے''۔ سمیرا نے کہا تو وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

آج انتیسواں روزہ تھا اور ماہم کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ حسیب نے اب تک اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر حسیب اب بھی نہ آیا تو وہ گھر والوں کو کیا جواب دے گی۔ اسے جھوٹ بولنے پر سب سے ڈانٹ پڑنی تھی اور حسیب کی الگ شامت آنی تھی۔ افطار کے بعد مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے اس نے اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی۔ وہ کافی دیر تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ مسجد کے اسپیکر سے عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہوا۔ ٹی وی پر بتایا گیا تو ماہم کی آنکھیں ایک بار پھر اشک بار ہوگئیں۔

''ماہم ...... ماہم باہر آؤ بھئی عید کا چاند نظر آگیا ہے اور دیکھو تو کون آیا ہے؟'' سمیرا بھابی نے اس کے دروازے پر دستک دے کر اندر جھانکتے ہوئے کہا وہ رخ پھیر کر بیٹھی تھی اس لیے سمیرا بھابی کو علم نہیں ہوسکا کہ وہ رو رہی ہے۔

''کون آیا ہے؟'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری کوئی انٹرنیٹ فرینڈ ہے''۔

''اوہ گاڈ وہ سچ مچ آگئی''۔ ماہم نے سٹپٹاتے ہوئے اپنا چہرہ صاف کیا۔

''ہاں اور تمہارے لیے چوڑیاں، مہندی، گجرے، ڈریس، جیولری اور نجانے کیا کچھ لائی ہے فوراً آؤ میں جاتی ہوں ان کی خاطر مدارات بھی تو کرنی ہے''۔

''بھابھی میں ذرا حلیہ درست کرلوں''۔ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''ضرور مگر جلدی کرو کیونکہ وہاں تم سے ملنے کی بے تابی عروج پر ہے''۔ سمیرا

بھابی نے مسکراتے ہوئے شوخی بھرے لہجے میں کہا اور واپس پلٹ گئیں۔

ماہم نے جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کیا بالوں میں برش پھیرا اور شانوں پر دوپٹہ پھیلا کر کمرے سے باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ منیب صاحب اور حسیب ممی، ڈیڈی اور رضوان بھائی سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میز پر مٹھائی کی ٹوکری اور بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ منیب صاحب رات ہی کراچی پہنچے تھے۔ عید اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ منانے کے لیے ان دونوں کی نظریں ایک ساتھ ماہم کی جانب اٹھیں تھیں۔ حسیب کی آنکھوں میں ندامت اور محبت کا واضح عکس نظر آیا اسے مگر انجان بن گئی اور منیب صاحب کو سلام کیا اور ان کے قریب آگئی۔

''وعلیکم السلام جیتی رہو کیسی ہے ہماری بیٹی بہت کمزور لگ رہی ہے۔'' منیب صاحب نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر پیار سے کہا۔

''نہیں تو میں تو بالکل ٹھیک ہوں آپ نے دو ماہ بعد دیکھا ہے نہ اس لیے محسوس ہو رہا ہوگا''۔ ماہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاید خیر یہ لو یہ رہی ہماری بیٹی کی عیدی''۔

منیب صاحب نے ہنس کر کہا اور اپنے والٹ میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''شکریہ ابو مگر یہ تو بہت زیادہ ہیں''۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

''بالکل بھی زیادہ نہیں ہیں تم میری اکلوتی بہو بیٹی ہو تمہیں نہیں دوں گا تو اور کسے دوں گا چلو اب گھر چلنے کی تیاری کرو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ اس بار ہم باپ بیٹا بھی عید کو اس کے حقیقی رنگ میں انجوائے کریں گے تم اپنا سامان وغیرہ پیک کرلو ہم گھنٹے تک واپس چلیں گے۔'' منیب صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے حسیب کی طرف دیکھا اس نے ملتجی انداز میں سر ہلایا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

''ماہم کہاں جا رہی ہو چائے پی لو''۔ سمیرا بھابی ٹرالی کھسکاتے ہوئے ڈرائنگ

روم میں داخل ہوئیں تو اسے جاتے دیکھ کر بولیں۔

''بھابی میں اوپر جارہی ہوں عید کا چاند دیکھنے''۔اس نے بہانہ بنایا۔

''کیا اب بھی تمہیں عید کا چاند دیکھنے کی ضرورت ہے؟'' سمیرا بھابی نے شرارت سے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ ان کی بات کا مطلب سمجھ کر بولی۔

''مجھے تو ہے ثواب کمانا کسے برا لگتا ہے''۔

حسیب اس کے جاتے ہی بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ سب چائے پینے باتیں کرنے میں مگن تھے کہ وہ چپکے سے ڈرائنگ روم سے کھسک آیا۔

''حسیب بھائی آپ کہاں چلے؟'' سمیرا بھابی نے اسے لابی میں جالیا۔

''وہ میں...... عید کا چاند دیکھنے جارہا ہوں''۔ وہ گھبرا کر بولا۔

''عید کا چاند یا اپنا چاند بلکہ چندا''۔ سمیرا بھابی نے شوخی سے کہا۔

''اوہ بھابی ایک تو آپ ذہین بہت ہیں مگر پلیز نیچے کی صورتحال سنبھال لیے گا میں اپنی چندا کو منالوں وہ مجھ سے روٹھی ہوئی ہے''۔ وہ ہنس کر بولا۔

''انٹرنیٹ پر بیوقوف بنانے پر''۔ سمیرا بھابی کو اس نے صرف یہی بات بتائی تھی اسی لیے وہ یہی سمجھیں تھیں تو اس نے بھی فوراً ہاں کہہ کر جان چھڑائی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر چھت پر آیا تو اسے کرسی پر بیٹھے دیکھا وہ ہاتھ میں گلاب کا پھول پکڑے ہوئے تھی اور ایک ایک کر کے اس کی پتیاں توڑ رہی تھی۔

''ہائیں...... ہائیں ارے چندا اس پھول کا کیا قصور ہے جو اس کا پوسٹ مارٹم کیے جارہی ہو۔ قصور میرا ہے میں خطاوار ہوں۔ تمہارے سامنے حاضر ہوں اب جو چاہو سلوک کرو میرے ساتھ''۔ وہ اس کے سامنے کرسی قریب کھسکا کر بیٹھتے ہوئے بولا تو اس کی جانب دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی''۔

''کیوں آج کیا ہوا روز تو تم مجھ سے چیٹنگ کرتی ہو''۔ حسیب نے اس کے جھکے ہوئے چہرے کو بہت والہانہ پن سے دیکھتے ہوئے مسکراتے لہجے میں کہا تو چیٹنگ کا لفظ سن کر اس نے بری طرح چونکتے ہوئے سر اوپر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا

وہ بہت دلفریب انداز میں مسکرا رہا تھا اور اپنے کوٹ سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے

''چندا تم نے کہا تھا کہ اگر میں پھولوں کا کلیوں کا ہار اور گجرے لے کر آؤں تمہیں پہناؤں تو تم مان جاؤ گی یہ دیکھو میں تمہاری پسند کا زیور لے آیا ہوں اب تو مان جاؤ نا''۔

''آپ...... وہ''۔ ماہم حیرت سے گنگ ہوگئی تھی۔ مشکل سے یہ الفاظ زبان سے ادا ہوئے وہ ہنس کر بولا۔

''جی ہاں میں ہی تو ہوں آپ کا لور اور کون ہوسکتا ہوں ہے ماہم ڈیئر تمہارا ای میل ایڈریس اور ویب سائٹ میں نے ہی تو بنائی تھی تمہارا نک چندا بھی میں نے ہی تجویز کیا تھا بھول گئیں میری بھولی چندا''۔

''تو آپ نے مجھے بیوقوف بنایا''۔ وہ رونے کو ہوگئی۔

''مجبوری تھی تم نے دور رہ کر بہت بے قرار ہوگیا تھا میں سو انٹرنیٹ کے ذریعے تم سے چیٹنگ کرنے کا منصوبہ بنایا اور عمل بھی کیا۔ تم نے اپنا دکھ بلکہ میرا دیا ہوا دکھ مجھ ہی سے شیئر کیا یقین مانو میں اپنی غلطی پر بہت نادم تھا۔ مجھے تمہاری باتوں سے اور پھر بوا کے ذریعے سے پتا چل گیا تھا کہ تم بے قصور ہو۔ بوا کو میں نے تمہاری دوست عالیہ کے گھر نیاز دینے کے بھیجا تھا وہیں سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے میکے جا بیٹھی ہے۔ دراصل وہ خود اس عید پر اپنے شوہر سے ڈائمنڈ سیٹ کا مطالبہ کر رہی تھی اور اپنی فرمائش پوری کروانے کے چکر میں میکے جا بیٹھی تھی۔ عالیہ نے اپنی خواہش تم سے منسوب کر کے مجھے تم سے بدگمان کرنے کی کوشش کی تھی''

''اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی''۔ ماہم نے ساری تفصیل سن کر کہا۔

''نہیں ماہم''۔ وہ تڑپ کر بولا۔

''جب میں تمہیں یہاں چھوڑ کر گیا تھا تب گھر جا کر مجھے غصہ ٹھنڈا ہونے پر اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ پھر بوا نے میری حرکت کا سبب جان کر مجھے اصل بات بتائی تو میں اور زیادہ شرمسار ہوگیا تم سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا''۔

"تو آج کیسے کر لی ہمت؟" ماہم نے پرسکون ہو کر پوچھا۔
"کچھ ابو جان کے ساتھ ہونے کا حوصلہ تھا اور کچھ اس رات کا عید کا خیال تھا کہ عید پر تو لوگ اپنے دشمن کو بھی معاف کر کے گلے سے لگا لیتے ہیں۔ میں تو پھر تمہارا شوہر ہوں جس سے تمہیں بہت محبت ہے پلیز معاف کر کے مجھے بھی گلے سے لگا لو۔" وہ شرارت اور شوخی سے اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔
"آپ تو پہلے ہی میرے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں"۔ وہ سرخ ہو کر اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی تو اس نے اس کے دائیں بائیں کرسی کی دونوں بازوؤں پر اپنے ہاتھ جما لیے اور اس کے فرار کے راستے مسدود کر دیئے۔ اس کے قرب اور پرفیوم کی گجروں کی خوشبو نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا۔
"نہیں ہٹیں گے جب تک آپ ہمیں معاف نہیں کریں گی"۔ وہ اس کے شرم سے گھبراہٹ سے سرخ ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا مگر وہ خاموش ہی رہی۔
"چندا معاف کر دو نا"۔ اس نے تھک سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پیار سے کہا۔
"پہلے گجرے پہنائیں اور مجھ سے وعدہ کریں کہ آئندہ آپ مجھ پر کبھی شک نہیں کریں گے"۔ ماہم نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو کر اس کی پیشانی پر اپنی محبت اور وعدے کی مہر ثبت کر کے بولا۔
"وعدہ کا وعدہ"۔
"پہلی غلطی معاف کی دوسری پر معافی نہیں ملے گی"۔ اس نے روح تک سے سرشار و شاد ہو کر بڑی ادا سے کہا تو وہ اس کے ہاتھوں میں گجرے پہناتے ہوئے بولا۔
"دوسری غلطی کرے گا کون کم بخت مجھے تو پہلی ہی نے زندہ درگور کر دیا تھا"۔
"حبیب بھائی اب آ بھی جایئے کیا چاند نہیں ملا؟" سمیرا بھابی کی آواز سیڑھیوں کی جانب سے آئی تو وہ ہنس کر بولا۔
"بھابی چاند مل تو گیا ہے مگر مان نہیں رہا"۔

"مان تو گئی ہوں میں"۔ ماہم نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"سچ"۔ اس نے خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔
"تھینکس ماہم چلو اب تمہیں تمہارے نئے گھر کا تحفہ بھی دکھا دیں ڈیفنس میں ہمارا اپنا گھر مکمل ہو گیا ہے اور ہم اپنی یہ عید اپنے نئے گھر میں منائیں گے۔ یہ سرپرائز ڈائمنڈ سے زیادہ قیمتی ہے یقیناً تمہیں پسند آئے گا" وہ اس کے بالوں میں کلیوں کے ہار سجائے ہوئے بولا تو اس نے خفگی سے کہا۔
"پھر وہی ڈائمنڈ سیٹ"۔
"اوہ آئی ایم رئیلی سوری تمہارا ڈائمنڈ سیٹ تو میں ہوں ہے نا"۔ وہ فوراً معذرت کر کے شوخی پر اتر آیا۔
"اوہو"۔ ماہم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"انٹرنیٹ بڑے کام کی چیز ہے اس کی وجہ سے آج ہم چاند رات کو اکٹھے ہیں چندا کو چاند رات مبارک ہو"۔ حبیب نے بہت محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ کو بھی مبارک ہو"۔ ماہم نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔ عین اسی وقت کیمرے کی فلش لائٹ ان دونوں پر پڑی تو دونوں سٹپٹا گئے۔
"ساری مبارک بادیں تم دونوں ایک دوسرے کو ہی دے لینا کچھ ہمارے لیے بھی بچا لو۔" یہ رضوان بھائی کی چہکتی آواز تھی جو ان کی تصویر کھینچنے کے بعد سمیرا بھابی کے ساتھ اوپر آ چکے تھے۔ حبیب قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور ماہم بری طرح شرما کر وہاں سے نیچے بھاگی وہ تینوں ہنس پڑے۔
"یار ابھی تو اصل سین شروع ہوا تھا اور تم ٹپک پڑے۔" حبیب نے کہا۔
"یہ اصل سین اپنے گھر جا کر شروع کر لینا چلو نیچے انکل بلا رہے ہیں انہیں اپنی ماہم کو اپنے گھر لے جانے کی بہت جلدی ہے"۔ رضوان ہنس کر بولے۔
"جناب مجھے اپنی ماہم کو گھر لے جانے کی ان سے زیادہ جلدی ہے یہ دیکھو"۔ حبیب نے شوخی سے کہا اور بچوں کی طرح تیزی سے نیچے کی جانب بھاگا تو سمیرا

بھابی اور رضوان بھائی کو ہنسی آ گئی۔ ماہم سیڑھیوں پر موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی شرما کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماہم کی ساری ناراضگی دور ہوگئی تھی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''چندا توری چاندنی میں عید ہم منائیں گے، چندا توری چاندنی میں''۔ حسیب اسے محبت سے دیکھتے ہوئے اس کے چاند چہرے کو چھوتے ہوئے شوخ وشریر لہجے میں گنگنایا تو وہ خوشدلی سے بے ساختہ ہنس پڑی۔ سمیرا بھابی اور رضوان بھائی کی ہنسی بھی ان کی شوخی ہنسی میں شامل ہوگئی۔ ان کی شادی کے بعد کی پہلی عید ان کے استقبال کے موجود تھی اور عید کا چاند بھی انہیں مسکرا کر مبارک باد دے رہا تھا۔

☆☆☆

بادل چاند اور ستارہ

بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں شل ہوگئے تھے۔ ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی، حلق خشک اور چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ ایک ایک کر کے سارے آسرے مٹھی سے پھسل گئے تھے۔ بس ایک لفظ ریت کی طرح دعا کی ہتھیلیوں میں موجود تھا کہ یارب...... میری عزت بچائے رکھنا''۔ مزید بھاگنا تو دور کی بات تھی اس میں مزید چلنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ تھک کر اس نے پلیٹ فارم کے ستون کو تھام لیا۔ پھولی ہوئی سانسوں اور سوکھے حلق کو تر کرنے کا سامان کہیں نظر نہ آیا۔ وہ کہاں جائے، کہاں نہ جائے، کس سے مدد مانگے، کس کا ہاتھ تھامے، وہ پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ اوپر سے رات دور تک خوف پھیلا رہی تھی۔ اندھیری شب اور مہیب جنگل کی نیتیں کون جانے، اس کے سر پر تو ماں بھی نہیں تھی جو سفر پہ جاتے سے گھر سے نکلتے وقت اس کے سر کا صدقہ اتار دیتی۔ اس کے کانوں میں ریل گاڑی کی وسل کی گونج سنائی دی تو وہ خوفزدہ ہو کر آواز کی سمت دیکھنے لگی۔ ٹرین چلنے کو تیار کھڑی تھی۔ اس کے قدم خود بخود ٹرین کی سمت اٹھ گئے۔ بڑی سی سیاہ چادر میں اپنا سندر کومل وجود چھپائے، ہاتھ میں اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ تیزی سے ٹرین کی طرف لپکی اور ٹرین کے ایک ڈبے میں سوار ہوگئی۔ وہ اس علاقے سے جلد از جلد دور نکل جانا چاہتی تھی۔ انجان راستوں کا سفر...... اجنبی راہگذر اور وہ نہتی، بے امان بیس برس کی معصوم لڑکی۔ ''ستارہ'' جو خود اپنے ہی آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گرتی بجھتی اور سلگتی پھر رہی تھی۔

ٹرین کے جس ڈبے میں ستارہ سوار ہوئی تھی وہ بالکل خالی تھا۔ ٹرین کا فرسٹ کلاس ڈبہ تھا یہ...... ستارہ کو ایک سفری بیگ سیٹ پر رکھا نظر آیا مگر وہاں سامان کا مالک موجود نہیں تھا۔ وہ ڈری، سہمی دوسری سیٹ پر دبک کر بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں ٹرین چلنے کی اور ہونٹوں پر اپنے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگنے لگی۔

بادل خان، باتھ روم سے باہر نکلا تو ایک اجنبی لڑکی کو اپنے ڈبے میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ستارہ کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا اس کی جانب سے اس لیے وہ اسے دیکھ نہ سکا اور تولیہ اپنے ہاتھوں اور چہرے پر رگڑتا ہوا اس کے قریب آ کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟'' ...... ''میں'' ...... آواز سنتے ہی ستارہ خوف سے چیخ کر کھڑی ہو گئی اس کے چہرے سے چادر خود بخود پھسل گئی۔ اور بادل خان کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔ وہ جو اسے ایک ہی جھلک دکھا کر گھائل کر گئی تھی یوں اچانک اس کے سامنے آ جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ ٹرین چل چکی تھی اور بادل خان ستارہ کے خوفزدہ حسین چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ ستارہ نے گھبرا کر دائیں جانب سے چادر کا کونہ چہرے پر کھینچ لیا تو وہ چونکا اور سنبھل گیا۔ وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے پہچانتا ہے اور شاید چاہتا بھی ہے۔

''کون ہو تم اور کس کے ساتھ یہاں آئی ہو؟''۔ بادل خان نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

''میں .... اکیلی آئی ہوں''۔ اس نے گھبراتے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

''اپنے گھر سے بھاگ کر آئی ہو''۔ بادل خان نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شرم و حیا سے عاری و بے پردہ سینکڑوں لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ خود اس کا ہر وقت لڑکیوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ مگر اس نے ''ستارہ'' کو ان سب سے مختلف اور معصوم سمجھا تھا محسوس کیا تھا اور اب جب اس نے اقرار کیا کہ وہ گھر سے بھاگ کر آئی ہے تو اس کا خون کھول اٹھا اور خود بخود اس کا بھاری ہاتھ اٹھا اور اس کے نرم و ملائم گال پر انگلیوں کے نشان ثبت کر

گیا۔ ستارہ حیرت اور خوف سے سیٹ پر جا گری اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔

''کس کے ساتھ بھاگ کر آئی ہو۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ چلتی ٹرین سے تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا؟'' وہ تولیہ اپنی سیٹ پر پھینک کر اس کے سامنے کھڑا گرج رہا تھا۔

''میں خود اپنے ساتھ ...... بھاگ آئی ہوں۔ تمہیں اگر پھینکنا ہے تو ...... ان کو پھینکو جو ...... میری قیمت لگا رہے تھے۔ میرے ...... باپ اور اس کے بھتیجے نے الگ الگ ...... آدمیوں سے میری قیمت وصول کر لی ہے اور وہ دونوں مجھے بیچنا چاہتے ہیں۔ میں ...... دونوں کو ...... لڑتا چھوڑ کر اپنی عزت ...... بچا کر بھاگ آئی ہوں تو ...... کیا میں بری ہوں۔ میں نے برا کیا ہے؟'' وہ بولتے بولتے رو پڑی تو بادل خان نے اسے دیکھا اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''کتنی قیمت لگائی ہے تمہارے باپ نے تمہاری؟''

''پچاس ہزار'' ...... وہ روتے ہوئے بولی۔

''حالانکہ ...... پچاس لاکھ بھی بہت کم ہیں''۔ اس نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں''۔ تڑپ کر بولی تھی۔

''یہاں ہر بندہ بکاؤ مال ہے۔ بس قیمت، قیمت کا فرق ہے''۔

میرا اباپ ...... جس شخص سے میری ...... شادی پیسے لے کر کرنا چاہتا تھا اس شخص میں ...... ہر اخلاقی برائی موجود ہے۔ وہ خود ہی بتانے لگی۔

مثلاً ...... بادل خان اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ عورت ...... شراب اور جوئے کا عادی ہے''۔

''تم سے کس نے کہا؟''

''ابا کا بھتیجا شاہد بتا رہا تھا اور وہ مجھ سے دس پندرہ سال بڑا بھی ہے ابا کو ...... اس نے پچاس ہزار روپے دیئے تھے میرے بدلے میں''۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شخص تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہو۔ پیسے کا مطالبہ خود تمہارے باپ نے اس سے کیا ہو وہ شخص اتنا برا نہ ہو۔ جتنا تم نے اس کے متعلق سنا ہے''۔ بادل خان نے بے چینی سے کہا۔

''تو اس نے میری قیمت کیوں دی ابا سے کہہ کر سیدھے طریقے سے مجھ سے نکاح نہیں کر سکتا تھا وہ''۔ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

سیدھے طریقے سے تمہارا باپ نہیں مانا ہوگا اور وہ شخص تمہیں کھونا نہیں چاہتا ہوگا۔ اگر تمہارا باپ اس کے ہاتھ نہ سہی کسی اور شخص کے ہاتھ تمہیں بیچ دیتا تو بھی قیمت تو تمہاری لگتی نا۔ اور میرا خیال ہے کہ تم اتنی با صلاحیت تو ہو کہ ایک ...... برے اور بھٹکے ہوئے شخص کو سنوار سکو اچھا آدمی بنا سکو''۔ بادل خان جانے کیوں وضاحتیں کر رہا تھا سمجھا رہا تھا شاید اس لیے کہ اس کے اپنے دل میں چور تھا۔

''مگر...... اس سے تو سب ڈرتے ہیں''۔

''کیا وہ بہت خوفناک ہے؟''

''مجھے کیا پتہ میں نے نہ تو اسے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا نام سنا ہے''۔

تو جس شخص کو تم نے دیکھا نہیں ...... جس کا تم نام تک نہیں جانتیں تم اس کی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ ایک آدمی سے بچنے کے لیے ہزاروں آدمیوں کے ہجوم میں داخل ہو گئیں کیا بچے کا تمہارا۔ بے آبرو ہونے کے بعد سوائے خودکشی کے کوئی راستہ رہ جائے گا تمہارے پاس؟'' وہ غصیلے اور بارعب لہجے میں اسے ڈانٹ رہا تھا ڈرا رہا تھا۔

''خودکشی تو...... حرام ہوتی ہے''۔ وہ ڈر کر بولی۔

''تو یہاں حلال کر کے کھانے کی عادت کسے ہے، سب کے منہ کو حرام لگا ہے''۔

''کیا تمہارے منہ کو بھی؟'' بے اختیار ہی اس کی زبان پھسل گئی تھی اور بادل خان غضبناک ہو کر اٹھا اور اس کے قریب آ کر بولا۔ ''بتاؤں''۔

''نہیں''۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تو بادل کا دل اس کی آنکھوں

میں اترتے پانیوں میں ڈوب ڈوب گیا۔ اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نہ پیش قدمی کرنا نہ مزاحمت روکنا، اس کے لیے تو سینکڑوں دل اور آنکھیں ہر وقت بچھی رہتی تھیں۔ اس کی تسکین جان تسکین نفس کا سامان تو خود بخود ہو جاتا تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ وہ صنف نازک کو لمحوں میں اپنا اسیر کر لیتا تھا۔ اس کی باتوں کا جادو، لہجے کی بے خودی اس کا بڑا خوبصورت ہتھیار تھا مقابل کو اپنی مرضی سے چلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مگر ہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ وہ ستارہ کے معاملے میں خود کو بہت مجبور اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اپنی تمام تر بے تابیوں کے باوجود وہ اسے چھونے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔ حالانکہ یہاں اسے کچھ بھی کرنے سے کوئی بھی تو روکنے والا نہیں تھا۔ چلتی ٹرین کا خالی ڈبہ تھا اور اس کے سامنے ایک حسین وجمیل نوخیز کلی تھی۔ باہر رات کا اندھیرا تھا۔ اس کے اندر شیطان کا بسیرا تھا مگر کیسے وہ اپنے اندر کے شیطان کو سلانے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے پاس سے واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ستارہ نے سکون کا سانس لیا۔

''اب کہاں جاؤ گی تم؟''۔ بادل خان نے پوچھا۔

''جہاں یہ ٹرین لے جائے گی''۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا بیوقوف لڑکی'' ...... وہ غصے سے بولا۔

کیوں ڈانٹ رہے ہیں آپ مجھے اور آپ نے مجھے ...... تھپڑ بھی مارا آپ کو۔ کوئی حق نہیں ہے مجھے ڈانٹنے اور مارنے کا۔ وہ بھیگی آواز میں بولی۔ چپ کر وحق کی بچی۔ یہاں حق اسی کا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ سو جاؤ اب رات بہت ہو گئی ہے''۔ وہ لیٹتے ہوئے بارعب لہجے میں بولا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے''۔ اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

''تو گھر سے کیوں نکلی تھیں؟'' بادل خان غصے سے اٹھ بیٹھا اور اس کے چہرے کو دیکھتے اور اٹھا۔ ''یہاں تو قدم قدم پہ بھیڑیے موجود ہیں''۔

''آپ تو نہیں ہیں ناں؟'' ...... اس نے بھیگی آنکھوں سے اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

''کیا خبر میں بھی ہوں؟'' وہ نظریں چرا کر بولا۔

''نہیں...... آپ نہیں ہو سکتے''۔ وہ رونے لگی۔

اچھا اب رونا بند کرو خود کو مضبوط بناؤ ورنہ میں کمزور پڑ جاؤں گا اور میں تمہارے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ آنسو پونچھنے کے بعد اس سے پوچھ رہی تھی۔

''بادل خان''۔ اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

کاش...... اس بادل کا سایہ مجھے مل جائے۔ اس نے دل میں سوچا اور پھر اپنا نام بتانے لگی کہ میں ''ستارہ'' ہوں

''میں جانتا ہوں''۔

''جی''...... اس نے حیرانگی سے اپنی جمیل کنول سی آنکھیں پٹپٹائیں تو اس کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تمہارا چہرہ تمہارے نام کا عکس ہے اس مناسبت سے تمہارا یہی نام میرے ذہن میں آیا تھا''۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔ تو وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' اس نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

''جہاں میرا دل چاہے رہ لیتا ہوں کبھی یہاں کبھی وہاں''۔ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''آپ نے علیحدہ ڈبہ کیوں بک کرایا ہے؟'' ''وہ اس کا جواب سمجھ نہیں سکی تھی مگر فوراً ہی اگلا سوال کر ڈالا تو وہ سیٹ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے کہ مجھے بے ہنگم ہجوم میں سفر کرنا پسند نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ ہماری یہ ٹرین سروس اتنی شاندار نہیں ہے کہ بندہ خیریت اور صحت و عزت کے ساتھ بھرے ڈبے میں سفر کر سکے۔

''آپ نے کتنا پڑھا ہے؟'' ...... وہ اس کی آخری بات پر مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''ایم۔ بی۔ اے کیا ہے میں نے''۔

''میں نے بی۔ اے کیا ہے اسی سال''۔ وہ شاید اپنا خوف اور دھیان بٹانے

کو بولنے جا رہی تھی۔

آئی نو...... اب سو جاؤ۔ اور ہاں تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں''۔

اسے اچانک یاد آیا تو پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

عجیب لڑکی ہو سامنے اتنا بڑا فلاسک رکھا ہے کھانے کا ٹفن موجود ہے پھر بھی تمہاری بھوک نہیں چمکی۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''انسان کو اپنی بھوک پر کنٹرول ہونا چاہیے''۔ وہ گہرے لہجے میں بولی۔

''ہاں نفس کی بھوک پر، لیکن پیٹ کی بھوک پر ایک حد تک ہی کنٹرول کیا جا سکتا ہے یہ لنچ بکس اٹھاؤ اور کھانا کھا لو۔ فلاسک میں چائے بھی ہے پی لینا''۔ اس نے لیٹے لیٹے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''نہیں شکریہ''۔

وہ جانے کیوں ایک اجنبی سے کچھ لے کر کھانے سے جھجک رہی تھی اور کچھ خوفزدہ بھی تھی کہ کہیں کھانے میں کچھ ملا ہوا نہ ہو اور اس کے ساتھ ہاتھ نہ ہو جائے۔

بادل خان اس کے جواب اور لہجے پر بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔

''اگر اتنی ہی بے اعتباری ہے ناں...... تو اٹھو فوراً سے پہلے میرے ڈبے سے باہر نکل جاؤ...... ہری اپ''۔ وہ اس کی بات سمجھ گیا تھا جبھی تو غصے سے بولتا اس کے سر پر کھڑا تھا۔

''میں...... کہاں جاؤں گی؟'' وہ سہمی ہوئی بھیگی آواز میں بولی۔

''میری بلا سے جہاں مرضی جاؤ مگر میرا کمپارٹمنٹ خالی کر دو''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

آپ تو...... ایسا مت کریں میرے ساتھ۔ وہ رو پڑی بادل خان نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے صحیفے اترتے دیکھے تو اس کا دل چاہا کہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے اس کے سارے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لے۔ دل تڑپ تڑپ کر اس کی طرف ہمک رہا تھا۔ وہ اس کی معصوم حسین و جمیل، خوف اور آنسوؤں سے

بھری صورت پر نثار ہو رہا تھا کہ اچانک ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل ہوا۔

''ٹکٹ سر''۔ ٹکٹ چیکر نے بادل خان سے کہا اور دوسری نگاہ سہمی ہوئی روتی ہوئی ستارہ پر ڈالی۔ اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی ان دونوں کے درمیان۔

''یہ لو ٹکٹ''۔ بادل خان نے اپنی قمیض کی جیب میں سے اپنا ٹکٹ نکال کر اسے تھما دیا جو اس نے دیکھ کر واپس کر دیا اور پھر ستارہ کی طرف آیا۔

ٹکٹ چیک کروائیں بی بی......

جی...... ٹکٹ...... وہ تو...... نہیں ہے میرے پاس...... وہ رونا بھول کر ٹپٹا کر بولی ٹکٹ چیکر کو دال میں کچھ کالا دکھائی دیا۔ اس نے بادل خان کو الگ سیٹ پر اور اسے یوں روتا ڈرا دیکھا تو یہی اندازہ لگایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں یا تو لڑکی بھاگ کر آئی ہے یا پھر اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک در آئی تھی۔ ستارہ کا حسین چہرہ دیکھ کر ستارہ اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھ کر مزید خوفزدہ ہو گئی۔

آپ بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہی ہیں بی بی...... ٹکٹ چیکر نے کہا۔

آپ کو کیا مسئلہ ہے بھئی۔ ان کا ٹکٹ ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے گر گیا تھا۔ آپ جرمانہ لیں اور چلتے نظر آئیں''۔ بادل خان نے ستارہ کی حالت دیکھ کر فوراً معاملہ سنبھالتے ہوئے اپنے والٹ میں سے رقم نکال کر ٹکٹ چیکر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

سر۔ یہ خاتون آپ کے ساتھ ہیں''۔ ٹکٹ چیکر نے ستارہ کو ہوس زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی رقم اس کے ہاتھ سے لے لی۔

جی ہاں یہ خاتون میری بیوی ہیں اور بیوی اپنے شوہر کے ساتھ ہی ہو گی یہ کمپارٹمنٹ میں نے آپ کے لیے تو بک نہیں کرایا۔ وہ غصے سے تیز لہجے میں بولا۔

''سوری سر۔ یہ رسید لیں''۔ ٹکٹ چیکر نے شرمندہ ہو کر کہا رسید اور بقایا رقم بادل خان کو واپس دی اور جاتے جاتے ایک نگاہ ستارہ کے سراپے پر ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔ ستارہ نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا ایک

لمحے کو آنکھیں بند کیں اور پھر آنکھیں کھول کر بادل خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو بادل...... آپ تو میرے لیے رحمت کا بادل ثابت ہوئے ہیں''۔

''کیا واقعی میں اس قابل ہوں؟'' اس کی زبان سے اپنی تعریف سن کر اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''میرے لیے تو ہیں''۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دل سے کہا۔

''اب اپنی اس بات پر قائم رہنا۔ کیونکہ اب میں جہاں رہنا چاہتا ہوں وہاں صرف تمہارا اختیار چلتا ہے''۔ وہ معنی خیز بات کہہ کر اسے الجھا گیا۔

''میں سمجھی نہیں''......

کھانا کھا لو سمجھ جاؤ گی۔ خالی پیٹ تو دماغ بھی کام نہیں کرتا سمجھ کیا خاک آئے گی۔ وہ لنچ بکس اور فلاسک اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ نہیں کھائیں گے''...... اس نے لنچ بکس کھولتے ہوئے پوچھا وہ اب کھانے سے انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب تک کا اس کا رویہ تو اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ اس نے کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی حالانکہ کر سکتا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور کمزور تھی۔ اس کا یہ رویہ ہی اسے حوصلہ دلا رہا تھا۔

''میں کھا کر ہی ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ یہ تو احتیاطاً رکھوا لیا تھا تم سیر ہو کر کھاؤ میری فکر مت کرو۔ ایک بھوک پر کنٹرول کر لیا ہے تو یہ بھوک بھی کنٹرول ہو سکتی ہے''۔ وہ آخر میں معنی خیز بات کہتا اپنی جگہ پر جا لیٹا۔

سنیں...... وہ ٹکٹ چیکر دوبارہ تو نہیں آئے گا یہاں......

وہ کھانا کھاتے کھاتے اچانک ٹکٹ چیکر کی شیطانی نظروں کو یاد کر کے پوچھ بیٹھی۔

''نہیں آئے گا؟''......

''اور اگر آ گیا تو''۔

"تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟"۔ وہ جھلا کر بولا۔

وہ مجھے بہت بری نظروں سے دیکھ رہا تھا میرا دل کانپ گیا تھا اس کے دیکھنے سے"۔

وہ نظریں جھکائے مدھم اور پرنم لہجے میں بولی تو اس نے پیار سے اسے دیکھا سنو میں یہاں موجود ہوں برابر والے ڈبے میں میرے آدمی بھی موجود ہیں"۔

"آپ کے آدمی"۔ وہ حیران پریشان ہو کر بولی اسے ہنسی آ گئی اس کی حالت پر۔ گھبرانے والی بات نہیں ہے وہ میرے گارڈ ہیں ملازم ہیں ٹکٹ چیکر آئے گا تو میں دیکھ لوں گا اسے۔ تم اطمینان سے کھانا کھا کر سو جاؤ۔

"آپ سونے لگے ہیں؟"

کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے ذومعنی بات کہہ کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے گھبرا کر نظریں کھانے پر جمالیں بھوک تو زوروں کی لگی ہوئی تھی مگر اس نے بہت آرام سے صبر سے کھانا کھایا۔ چائے پی کر وہ تھوڑی دیر قرآنی آیات اور درود پاک کا ورد کرتی رہی پھر تھک کر لیٹ گئی۔ لیٹنے سے اسے بہت سکون اور آرام ملا اور چند منٹ بعد اسے نیند نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ آنکھ اس کی اس وقت کھلی جب بادل خان کی غصے سے بھری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"او خبیث آدمی تیری یہ مجال"......

یا اللہ...... ستارہ نے ٹکٹ چیکر کو بادل خان کے شکنجے میں دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا وہ گھبرا کر ڈر کر اٹھ بیٹھی تو اس کا خدشہ درست تھا وہ اپنی کمینگی دکھانے یہاں آ ہی گیا تھا۔ وہ اندر تک سے خوف سے کانپنے لگی۔

معاف کر دیں سر...... ٹکٹ چیکر اپنی درگت بننے پر منمنایا۔

معافی کے بچے تیرا تو میں کچومر نکال دوں گا۔ تجھے جرات کیسے ہوئی یہاں دوبارہ داخل ہونے کی۔ بے غیرت آدمی تیری آنکھوں کی شرم کہاں مر گئی ہے ہیں...... تیرے گھر میں ماں، بہن، بیوی بیٹی نہیں ہے۔

"ہیں جی" وہ نیچے پڑا کراہتے ہوئے بولا بادل خان نے اس پر کھول گھونسوں

اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔

"تو بھیجوں میں اپنے بندوں کو ان کے پاس"۔ بادل خان نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا کہا نہیں! ابھی کسی معاف کر دیں سر جی۔

تجھے معافی نہیں موت ملے گی موت، میں تجھے اس چلتی ٹرین سے اٹھا کر باہر پھینکوں گا۔ چل سالے تجھے تیری دل پشوری کا مزہ چکھاتا ہوں"۔

بادل خان نے اسے گھسیٹ کر دروازے کے قریب لے جاتے ہوئے کہا وہ منتیں کر رہا تھا۔ ستارہ خوفزدہ ہو کر اس کے پاس دوڑی آئی۔

"بادل۔ چھوڑ دیں اسے"۔ ستارہ نے بادل خان کا بازو پکڑ کر کہا۔

یہ تمہیں چھیڑنے آیا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ چھوڑ دیں اسے۔ میں اگر جاگ نہ رہا ہوتا تو یہ تمہیں رومال سونگھا کر لے گیا تھا یہاں سے۔

بادل خان نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کا دل تو چاہا کہ وہ اسے سچ مچ ٹرین سے باہر پھینک دے مگر اس طرح مزید مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں ان دونوں کے لیے اس لیے اس نے بادل خان کو روکنا ہی مناسب سمجھا۔

اللہ اسے سمجھے گا آپ گولی ماریے اسے۔

"مارو دو گولی پستول ہے میرے پاس"...... وہ مسکراتے ہوئے ٹکٹ چیکر کو ٹھڈا مار کر بولا۔

نہیں بادل پلیز آپ قانون ہاتھ میں نہ لیں۔ اس نے پریشان ہو کر جلدی سے کہا۔

"تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں"۔ بادل خان نے آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ سرخ ہو گئی اور نظریں چرا کر بولی۔ "دفعہ کریں اسے"۔

دفعہ ہو جا بھئی باہر تیرا استقبال کرنے کے لیے میرے بندے موجود ہیں باقی تواضع وہ کریں گے تیری تاکہ آئندہ تجھے کسی کی عورت پر بری نظر ڈالنے کی جرات نہ ہو سکے۔ چل خبیث۔ "ٹونی لے جاؤ اسے"۔

بادل خان نے اسے اچھی طرح ادھ موا کر کے باہر دھکیل دیا اس کے گارڈ

ٹکٹ چیکر کو اٹھا کر لے گئے تو اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے ستارہ کی صورت کو دیکھا جو خوف سے پیلی پڑ رہی تھی۔ وہ گلاب کا پھول اس وقت سرسوں کی کلی لگ رہی تھی۔ اس نے اب تک بادل خان کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔ ریلکیس ستارہ...... اب وہ خبیث نہیں آئے گا''۔

اور ستارہ نے اس کے ہاتھ کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کر کے ایک دم سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ جیسے اسے اچانک کرنٹ لگ گیا ہو۔ بادل خان کو ہنسی آ گئی۔ کتنی دلکش ہے اس کی ہنسی۔ ستارہ نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

''بادل میں بجلی تھی جو تمہیں کرنٹ لگ گیا''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرا چھپا کر رونے لگی۔ بادل خان نے چڑ کر کہا۔

''اوفوہ...... اب رونے سے کیا حاصل، شکر کرو جان بھی بچ گئی اور آن بھی''۔

''یہ سب...... کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ؟'' وہ روتے ہوئے اٹک اٹک کر بولی۔

''ابھی تو بہت کچھ ہو گا تمہارے ساتھ آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا؟''

''آپ مذاق کر رہے ہیں؟''

نہیں حجت کر رہا ہوں...... وہ فلاسک اٹھاتے ہوئے بولا تو وہ جھینپ گئی۔

ابھی تو ایک شیطان آیا تھا اور تم ابھی سے ہمت ہار بیٹھیں۔ وہ چائے کا مگ چائے سے بھرتے ہوئے بولا۔

اب میں کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے روتے ہوئے بولی۔

''سوچو''۔ وہ چائے کا سپ لے کر اطمینان سے بولا۔

''آپ بتائیں ناں؟''

''میری بات...... میرا مشورہ مان لو گی''۔

''جی''۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا تو وہ بولی۔ کیونکہ آپ اچھے آدمی ہیں''۔

اچھا...... چلو کچھ سوچتے ہیں اور یہ رونا بند کرو خواہ مخواہ مجھے الجھا رہی ہو''۔

بادل خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس نے جلدی سے اپنی ہتھیلیوں سے آنسو صاف کر لیے۔ بادل خان کو وہ چھوٹی بچی لگی تھی اس وقت وہ مسکرا دیا۔

ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ کراچی کے اسٹیشن پر اترے۔ بادل خان کے گارڈ اس کا سامان لے کر وہاں پہلے سے موجود اس کی گاڑی کی طرف لپکے تھے۔ ستارہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی گٹھڑی بازوؤں میں دبائے چادر میں چھپائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ بادل خان کو ایک شاندار گاڑی کی جانب بڑھتا دیکھ کر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ خود کو اس قدر دولت مند شخص کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں پا رہی تھی۔ بادل خان نے ڈرائیور کو گارڈز کی گاڑی میں جانے کا اشارہ کیا یکایک اس کی نظر ٹکٹ چیکر کے زخمی حلیے پر پڑی جو کسی شخص کا سہارا لے کر کھڑا تھا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے ستارہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ ستارہ بھی شاید اسے دیکھ چکی تھی۔ جبھی پریشان کھڑی تھی۔

ستارہ...... چلو آؤ میرے ساتھ وہ خبیث ٹکٹ چیکر ادھر ہی گھور رہا ہے۔

بادل خان نے آگے بڑھ کر ستارہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو وہ بنا کسی حیل و حجت کے فوراً ہی اس کے ساتھ چل دی۔ اس نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تو وہ خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گارڈز کو کچھ ہدایات دے کر اپنی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ چند منٹ میں وہ اسٹیشن کے احاطے سے بہت دور نکل آئے تھے۔

''آپ بہت امیر آدمی ہیں''۔ ستارہ نے چپ توڑتے ہوئے کہا۔

ہاں شاید لوگ تو یہی کہتے ہیں لیکن کیا روپے پیسے سے آدمی امیر ہوتا ہے؟

پتہ نہیں...... آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟

''تم کہاں جانا پسند کرو گی؟'' اس نے ایک نظر اس کے تھکے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ آپ تو بہت بڑے بزنس مین ہیں، آپ مجھے اپنے گھر یا دفتر میں ملازم رکھ لیں۔

میں حسین لڑکیوں کو ملازم کی حیثیت سے نہیں رکھتا۔
تو کس حیثیت سے رکھتے ہیں؟
تم میری بیوی کی حیثیت سے میرے گھر جانا پسند کرو گی۔
"جی"۔ وہ ٹپٹا گئی تو اس نے گاڑی روک دی اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑھ کر بولا۔ شادی کرو گی مجھ سے......
شا...... دی...... مگر آپ تو بہت۔ امیر آدمی ہیں۔ وہ ٹپٹا کر سرخ پڑتے ہوئے بولی۔
تو کیا امیر آدمی شادی نہیں کرتا؟ وہ مسکرایا۔
مگر میرے پاس تو۔ کچھ نہیں ہے آپ کو دینے کے لیے۔ وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ تمہارے ہی پاس تو سب کچھ ہے مجھے دینے کے لیے۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پلکیں حیا کے بارے اٹھ نہیں رہی تھیں رخساروں پر لالیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ بادل خان بہت حیرت اور بے خودی کے عالم میں اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔
"بولو اقرار یا انکار"۔ وہ پوچھ رہا تھا۔
اگر انکار کرو گی تو......
تو اسی جگہ گاڑی سے اتار دوں گا۔ اس نے مذاق سے کہا تو اس نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا بادل خان کا دل جیسے اس نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا وہ ہنس کر بولا۔
مذاق کر رہا ہوں۔ بتاؤ شادی کرو گی مجھ سے۔
جیسے آپ کی مرضی...... وہ اتنے اچھے بندے کو کھو کر در بدر نہیں ہونا چاہتی تھی اس نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکا لیا۔
میری مرضی تو ہے میں تو تمہاری مرضی پوچھ رہا ہوں۔ اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے اقرار کرے فطری حیا آڑے آ رہی تھی وہ اپنی چادر کے کونے کو مروڑ رہی تھی۔ الجھ رہی تھی۔ بادل خان نے بہت دلچسپی

سے اسے دیکھا اور پھر خود ہی پوچھا۔ گھر چلیں ستارہ...... اور ستارہ نے آہستہ سے اقرار واثبات میں سر ہلا دیا۔
"تھینکس"...... بادل خان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔
بادل خان نے گھر جانے سے پہلے شہر کی مشہور بوتیک سے اس کے لیے کئی ملبوسات خریدے۔ عروسی جوڑا جیولری، جوتے میک اپ کٹ وغیرہ اور ستارہ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی کہ ان کی ہر مہنگی دکان پر اچھی خاصی جان پہچان تھی سبھی اس کا گرمجوشی سے استقبال کر رہے تھے۔ شاپنگ کرنے کے بعد وہ اسے "بادل ہاؤس" لے آیا۔ دو کینال کی یہ شاندار کوٹھی ستارہ کی حیرت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اتنا امیر آدمی اس غریب بے کس و بے سہارا لڑکی سے آخر کیوں شادی کر رہا ہے؟ یہ سوال ستارہ کے دماغ میں بار بار سر اٹھا رہا تھا مگر وہ دوبارہ بادل خان سے پوچھنے کی جرات نہیں کر پائی۔ وہ اسے ایک شاندار بیڈروم میں لے آیا۔
ستارہ۔ تم یہاں آرام کرو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میں شادی کے باقی انتظامات کرتا ہوں۔ ہمارا نکاح آج شام کو ہو گا تب تک ہم دونوں سفر کی تھکن بھی سو کر اتار لیں گے تا کہ شام کو تر و تازہ ہو کر نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔
بادل خان نے شاپنگ بیگز اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟ اس نے اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔
اب نہیں رہوں گا اکیلا۔ اس کا جواب معنی خیز تھا وہ بلش ہو گئی۔
میرا مطلب ہے آپ کے امی ابو کہاں ہیں؟
دونوں ملک اور شہر سے باہر ہیں۔ اس سوال پر وہ سنجیدہ اور تلخ ہو کر بولا۔
آپ نے تو ان سے تو شادی کی اجازت نہیں لی انہیں بتایا بھی نہیں وہ خفا ہوں گے آپ سے"۔
ستارہ نے نرم اور مدھم آواز میں کہا تو وہ بھڑک کر بولا۔
کیوں خفا ہوں گے وہ مجھ سے۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے سے علیحدگ

اختیار کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا...... بتایا تھا مجھے یا مجھ سے اجازت لی تھی انہوں نے میرے متعلق سوچا تک نہیں تھا ان دونوں نے...... ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر کے دونوں نے اپنی اپنی پسند سے دوسری شادی رچالی۔ میں کہاں تھا اس سارے قصے میں۔ مجھ سے کسی نے پوچھا تھا۔ میرا خیال تو کسی کو نہیں آیا تھا پھر اب میں اپنی شادی کرنے سے پہلے ان سے کیوں اجازت لوں۔ کیوں بتاؤں انہیں کہ میں شادی کرر ہا ہوں۔ کیا حق ہے ان کا مجھ پر۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتے ہیں تو میں بھی اپنی مرضی سے...... شادی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ماں اپنے دوسرے شوہر اور بچوں کے ساتھ اسلام آباد میں خوش باش رہتی ہے اور باپ لندن میں اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ ان دونوں کی زندگی میں، میں کہاں ہوں...... کہیں بھی نہیں...... کبھی بھولے سے بھی انہیں خیال آیا کہ ان کا ایک بیٹا ان کے پیار اور توجہ کو ترس رہا ہے۔ انہوں نے مجھے...... کبھی عید بقر عید پر وش کیا نہ انہیں میرا برتھ ڈے یاد رہا۔ پھر میں کیوں انہیں یاد رکھوں اپنی شادی کے موقع پر۔ صرف روپے پیسے تو انسان کی اولاد کی ضرورت نہیں ہوتے۔ روپیہ پیسہ دے کر وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے۔ میں نے خود کو بزنس میں غرق کر لیا ان کے دس فیصد کو سو فیصد تک پہنچا دیا ہے۔ اب تو مجھے ان کے روپے پیسے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بلکہ ان کا دیا ہوا سرمایہ میں انہیں واپس لوٹا سکتا ہوں بمعہ سود...... لیکن وہ مجھے کیا لوٹائیں گے۔ میرا بچپن جو تنہائی میں ان کے پیار اور توجہ کو ترستے گزر گیا۔ میرا لڑکپن جوان کے ساتھ کھیلتے، بولتے اپنی کامیابیاں شیئر کرنے کو بے چین ختم ہو گیا۔ یا میری جوانی جو مجھے کبھی اندھیروں میں لے گئی تو کبھی پستی میں لا پھینکا۔ بولو کیا لوٹائیں گے وہ مجھے...... کیوں بتاؤں میں انہیں کہ میں بھی زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے جا رہا ہوں۔ ہاں کیوں بتاؤں؟'' ......

وہ بولتے بولتے بہت غصیلا اور جذباتی سا ہو گیا تھا۔ اس کی مفید رنگت غصے سے لہو رنگ ہو گئی تھی آواز میں بادلوں کی سی گرج چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ستارہ اس کی دکھ بھری داستان سن کر اس کی حالت دیکھ کر بہت دکھی اور خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے

اندازہ نہیں تھا کہ بادل خان اندر سے اس قدر ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا اور دکھی انسان ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے اپنی تمام تر محبتیں اس کے نام کرنے کا عہد کر لیا۔ وہ پیار کو ترسا ہوا تھا تو محبت کی پیاس تو اسے بھی ہلکان کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا دکھ اپنی محبتوں سے سمیٹ سکتے تھے۔ ایک دوجے کے ساتھ خوش رہ سکتے تھے۔

آئی۔ ایم۔ سوری...... مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا۔ ستارہ نے مدھم آواز میں کہا۔

اٹس آل رائیٹ...... تم آرام کرو شام میں ملاقات ہو گی۔

وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور نہا کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سو گئی۔ شام کو عصر کے بعد اسے بیوٹیشن تیار کرنے پہنچ گئیں۔ بادل خان نے نکاح کی یہ تقریب مختصر پیمانے پر منعقد کی تھی۔ جس میں اس کے قریبی دوست اور ہمسائے بیرسٹر اختر یزدانی ان کے بیٹے انور یزدانی جو بادل کے دوست تھے ان کی بیگم ڈاکٹر صائمہ ان کے بچے اور بیگم اختر یزدانی شامل تھیں اور بادل خان کی کمپنی کے منیجر اور لیگل ایڈوائزر زبیر صاحب شامل تھے۔ قبول و ایجاب کی رسم ادا ہونے کے بعد تمام مہمانوں کی تواضع پر تکلف کھانوں سے کی گئی۔ صرف یزدانی فیملی رہ گئی تو صائمہ بھابھی ستارہ کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ سب نے اسے شادی کی مبارکباد اور سلامی دی۔ بادل خان نے سرخ عروسی کامدار خوبصورت لباس میں برائیڈل میک اپ میں بجلیاں گراتی ستارہ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ بادل بھائی...... یہ انار کی کلی کہاں سے چرا کر لائے ہیں؟ صائمہ بھابھی نے ستارہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا تو ستارہ حیا سے سمٹ گئی۔

یہ انار کی کلی دراصل میرے نصیب کا ستارہ ہے اسے تو میرے آسمان پر چمکنا ہی تھا۔ بادل نے ہنس کر ستارہ کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ہوں۔ یہ بادل کا ستارہ ہے۔ بیگم اختر یزدانی نے کہا تو سب ہنس پڑے۔ جانے سے پہلے صائمہ بھابھی ستارہ کو بادل خان کے بیڈ روم میں پھولوں سے سجی مسہری پر بٹھا گئیں۔ سب لوگ رخصت ہو گئے تو بادل خان نے اپنے بیڈ روم میں قدم رکھا۔ وہ خود بھی

تھری پیس بلیک سوٹ میں بے حد وجیہہ، اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ستارہ گھبرا رہی تھی۔ دو دن میں وہ کیا سے کیا بن گئی تھی اسے یہ سب خواب معلوم ہو رہا تھا۔

ستارہ...... بادل خان نے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے بہت مدھم اور نرم لہجے میں پکارا۔ میں خوش ہوں تم سے شادی کر کے بہت خوش ہوں لیکن میں اس مضبوط بندھن کے حوالے سے تم سے تعلق استوار کرنے سے پہلے ...... کچھ حقائق تمہیں بتانا چاہتا ہوں تا کہ تم مجھ سے دل سے یہ تعلق استوار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکو۔ بادل خان نے اس کے چہرے کو وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس نے اپنا بھاری گھنی چمکدار پلکیں اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

ان آنکھوں نے تو مجھے لوٹ لیا ہے ان کا ہر رنگ ہر انداز ہی مجھے بے خود کر دینے کو کافی ہے۔ وہ اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے جذب سے بولا۔

آپ...... کچھ بتانا چاہ رہے تھے اس نے لرزتی آواز میں پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔ ہاں لیکن اس خوبصورت رات کو ان مہکتے لمحوں میں کسی تلخ حقیقت کی نذر نہیں کرنا چاہتا مگر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرا تم سے جو بھی تعلق استوار ہو دل کی گہرائی سے پوری سچائی سے ہو۔ مجبوری نہ ہو محبت ہو۔ آزار نہ ہو پیار ہو۔ پتہ نہیں کیوں میں تم سے بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ ستارہ...... تمہیں میرے اندر بہت سی خرابیاں نظر آئیں گی۔ میں......

وہ بولتے بولتے الجھ کر سر پکڑ کر خاموش ہو گیا۔

کہیے ناں...... میں سن رہی ہوں۔

ستارہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ستارہ...... میں بھی بہت سی اخلاقی برائیوں کا شکار ہوں۔

''مطلب''...... وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

مطلب یہ کہ میں ...... عورت، شراب اور جوئے کا عادی ہوں میری بہت سی گرل فرینڈز ہیں۔ جو اکثر یہاں آتی اور ٹھہرتی رہتی ہیں''۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلتی بے یقینی کو دیکھتے ہوئے اس پر انکشاف کر رہا تھا۔

آپ ...... مذاق کر رہے ہیں ناں؟......

نہیں ستارہ...... میں تمہارے ساتھ اس قسم کا مذاق ہرگز نہیں کر سکتا میں نے کہا نا کہ میں تمہارے ساتھ بے ایمانی نہیں کر سکتا اسی لیے سب کچھ سچ بتا رہا ہوں تم میرے دل کی خواہش بن گئیں سو میں نے تمہیں حاصل کر لیا۔

ان میں سے کسی سے شادی کیوں نہیں کی؟ ستارہ کا دل بجھ گیا تھا اس کی اس بات سے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تو وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

بتایا ناں...... کہ تم واحد لڑکی ہو جس نے میرے دل کو ایک دم سے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا تم میرے دل کی خواہش ہو۔

اور وہ سب...... کیا نفس کی خواہش ہیں؟'' ستارہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

ہاں شاید...... پتہ نہیں، مگر میرا رشتوں پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ خاص کر عورت پر سے میری ماں بھی تو عورت تھی اس نے نہ اپنے شوہر سے وفا کی اور نہ ہی اپنے بیٹے کی پرواہ کی۔ وہ بہت کرب آمیز لہجے میں بولا۔

''تو آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟''

کیونکہ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اور تمہارا اور میرا دکھ تقریباً ایک ہی سا ہی ہے۔ اسی لیے میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

حالانکہ آپ جیسے مردوں کو شادی کرنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔ وہ تلخی سے بولی۔ اس نے اسے کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلا تھا اس سے شادی کی ساری خوشی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ جیسے شخص سے وہ بچ کر وہ اپنے گھر سے نکلی تھی ویسے ہی شخص کے گھر میں ہی قسمت اسے لے آئی تھی۔

تمہارا جواب مجھے مل گیا ہے۔ میں جس قماش کا بندہ ہوں چاہوں تو اپنا حق زبردستی وصول کر سکتا ہوں لیکن ...... میرا دل نہیں مانتا تم سے زبردستی کو میرا دل نہیں مانتا اور جب تک تمہارا دل نہیں مانے گا میں خود کو پابند رکھوں گا۔ تم اس گھر میں اپنی مرضی سے جیسے چاہو رہ سکتی ہو تم پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔

بادل خان نے بہت سنجیدہ اور دکھی لہجے میں کہا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلا

گیا۔ یہ سب کیا ہے میرے مالک...... ستارہ نے بے بسی سے کہا۔

مجھے بادل خان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ جو بن گئے ہیں اس میں ان کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ محبت کی سچائی سے محروم ہیں۔ میں انہیں یہ سچائی لوٹا سکتی ہوں۔ بادل خان فطرتاً برے کردار کے مالک نہیں ہیں اگر ہوتے تو کیا میں یوں عزت کے ساتھ ان کی بیوی بن کر ان کے بیڈروم میں بیٹھی ہوتی۔ ان کا دل برا نہیں ہے ورنہ کل رات ٹرین کے اس خالی ڈبے میں میرے اور ان کے علاوہ کون تھا وہاں؟ وہ چاہتے تو مجھے بے بس اور بے عفت کر سکتے تھے مگر...... انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایسی نیت سے آنے والے کا مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا۔ میرا خیال رکھا تھا۔ مجھے بے امان نہیں ہونے دیا تھا۔ نہیں بادل، دل کے برے نہیں ہیں وہ اپنے والدین کی عدم توجہ اور بے کسی کے باعث ایسے بن گئے ہیں۔ جب سمجھانے، بتانے والا کوئی نہ ہو تو جوان اولاد اسی طرح غلط راستوں پر چل نکلتی ہے اور آج کے دور میں جہاں ڈش، کیبل اور سیلائٹ، انٹرنیٹ جیسے میڈیاز آ چکے ہیں اور نوجوان نسل کو کیا عمر رسیدہ لوگوں تک کو گمراہ کر رہے ہیں تو ایسے میں...... بادل خان کیسے اس برے اثرات سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ سچے اور اچھے ہیں جبھی تو ساری حقیقت مجھے بتادی اور مجھے کسی بات کے لیے مجبور بھی نہیں کیا۔ پھر مجھے ان پر طنز کرنے کا کوئی حق نہیں ہے میں نے انہیں محبت دینے کا خود سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کرنا اب میرا فرض ہے۔

میں اپنی محبت سے بادل کو بدل دوں گی۔ ان کی خراب عادات چھڑا دوں گی۔ میں انہیں ان کا کھویا ہوا اعتبار لوٹاؤں گی۔ میں انہیں یقین دلاؤں گی کہ ان سے سچی اور حقیقی محبت کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ جن میں سرفہرست میں خود ہوں۔ ''ستارہ'' جواب صرف ان کے نام سے چمکے گی۔ ستارہ نے دل میں کہا اور عہد کیا اچانک اسے آہٹ نے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا بادل خان کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ سوٹ کی جگہ اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا نیا نکور استری شدہ شلوار قمیض زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کا اونچا لمبا کسرتی بدن اس میں اور بھی نکھرا نکھرا لگ رہا

تھا۔ ستارہ کو وہ اپنے دل میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔

تم سو جاؤ میں شاید صبح تک ہی لوٹوں۔ بادل خان نے اس کی جانب دیکھ کر کہا وہ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکالنے لگا تو وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس کی بے رخی اسے بالاخانے کا رخ کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس نے دکھ سے سوچا شادی کی پہلی رات کی دلہن کو اس کا دولہا چھوڑ کر کہیں اور جا رہا تھا۔ ایسا وہ نہیں ہونے دے گی اسے روک لے گی اپنا حق استعمال کر کے...... وہ جانے کے لیے مڑا تو ستارہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ حیران ہوا۔

''کہاں جارہے ہیں آپ؟'' ستارہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔ وہاں جہاں میرے جیسے مردوں کو جانا چاہیے۔ وہ اس کے حسن کے جلوؤں کو دل میں اتارتے ہوئے زخمی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولا۔

آپ اب وہاں کبھی نہیں جائیں گے۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔

کیوں نہیں جانے دو گی؟ اس نے بے کلی اور بے تابی سے پوچھا۔

کیونکہ آپ اب صرف میرے ہیں۔ آپ کے قدم اب صرف میری جانب بڑھیں گے۔ میں کوئی اور عکس کوئی اور خوشبو آپ پر بکھرنے نہیں دوں گی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ سوچ لو ستارہ...... میں بہت برا آدمی ہوں۔ میں تو وہ جھیل ہوں جس کا سارا پانی گدلا اور خراب ہے تنگ آ کر تم راستہ تو نہیں بدل جاؤ گی۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ جھیل کا پانی خراب ہو جائے تو جھیل تو نہیں بدلی جاتی بلکہ اس جھیل کا پانی صاف کیا جاتا ہے اور کس نے کہا کہ آپ برے آدمی ہیں۔ آپ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ اس کی قمیض کے گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے بہت محبت بھرے لہجے میں بولی۔

''کب تک قائم رہو گی اپنے اس بیان پر؟'' وہ سرشار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''مرتے دم تک''۔

''کسی کے کہنے میں آ کر ہمسفر تو نہیں بدل لو گی''۔ وہ پوری طرح سے اس کا یقین چاہتا تھا۔

''نہیں اور کیوں بدلوں گی آپ تو میرے محسن ہیں۔ مجھے مشکل وقت میں سہارا دیا ہے آپ نے اور بادل ...... طوفان میں گھرے جہاز کو ساحل کے لائٹ ہاؤس کی بتی نظر آ جائے تو وہ ملاح نہیں بدلتے بلکہ ملاح کو بدلنے کی کوشش کرے اسے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ مجھے اگر کسی نے بہکانے یا آپ سے متعلق بدگمان کرنے کی کوشش کی تو میں بھی اس کا یہی حشر کروں گی''۔

سچ ستار...... بادل خان نے خوشی سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔

''میرا یقین کریں''۔ اس نے محبت سے کہا۔

''یاہو''۔ بادل خان نے خوشی سے نعرہ لگایا تو وہ ہنس پڑی۔

تو میری جان ...... یہ سارے نوٹ تمہارے سر کا صدقہ کیے میں نے۔ تم نے کہہ دیا تو اب میں کبھی ان گلیوں کا رخ نہیں کروں گا۔ تمہارے رخ زیبا پر تو اختیار ہے نا مجھے۔ بادل خان نے خوشی سے نوٹوں کی گڈیاں اس کے سر سے وار کر ہاتھ لگوا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں اور شرارت بھرے لہجے میں بولا تو وہ شرما گئی۔

''یہاں آؤ بادل کے دل کا ستارہ ...... اس نے اس شرمائی لجائی گڑیا جیسی ستارہ کو اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیا اور پھولوں بھری سیج پر بیٹھ گئی۔

یہ رہا تمہاری رونمائی کا تحفہ۔ اس نے پھولوں میں چھپا ایک خوبصورت ڈبہ نکال کر اس کے سامنے کھول دیا۔ اس میں ڈائمنڈ کا نازک اور نفیس بہت ہی خوبصورت سیٹ جگمگا رہا تھا۔ ستارہ کی آنکھیں حیرت مسرت بے یقینی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اس قدر چاہے جانے اور اہمیت دیئے جانے کے لائق ہو سکتی ہے اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کا دل اللہ کے حضور سجدے میں گر گیا۔

''تم تو اس ڈائمنڈ سے زیادہ قیمتی ہو۔ جلدی میں یہی خرید سکا۔ یہ پانچ لاکھ کا چیک ہے کل تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گا اسے اپنی شادی کا تحفہ سمجھو۔ بادل خان نے ڈبے میں رکھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

مجھے نہیں چاہیے یہ سب۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو کر رو پڑی۔

''تو کیا چاہیے بولو؟'' ...... اس نے بہت محبت سے اس کے چہرے کو چھوا۔

آپ کا پیار اور بس۔

پیار تو ملے گا ہی اور ''بس'' یار بس کی جگہ کار نہ خرید دوں زیادہ اچھی رہے گی۔ بادل خان مسکراتے ہوئے آخر جملہ مذاق سے کہا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

بے بس کرنے میں تمہارا جواب نہیں ہے۔ بادل خان نے معنی خیز اور شریر لہجے میں کہا تو وہ بری طرح شرما گئی۔ اور وہ اس پر محبت کا بادل بن کر چھا گیا۔

کتنے دن گزر گئے۔ بادخان اس کے حسن و جمال میں اس کی قربت و محبت میں ایسا گم ہوا کہ ادھر ادھر کا ہوش ہی نہ رہا اور وہ تو حیران تھی کہ وہ کتنا شدت پسند ہے محبت کے معاملے ...... شاید اس کے اندر کی محرومیاں اور جمع ہو جانے والے سارے جذبے ایک دم سے اندر آئے تھے۔ ایک ایک پل وہ اس پر نثار ہوتا اور وہ نہال اور سرشار ہو جاتی۔ اسے حیرت اس بات پر ہوتی کہ اس میں اب تک تو اس نے ایسی کوئی برائی نہیں دیکھی تھی جس کا خود اس نے شادی کی پہلی رات اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ وہ تو بہت محبت کرنے والا تھا۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اس کے لیے ملبوسات کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ جدید نئے اور قیمتی نئے فیشن کے ملبوسات، جیولری، جوتے اور اس کی ضرورت کی ہر چیز سے الماریاں اور وارڈ روب بھر دی تھیں۔ وہ تو ہر دم خدا کا شکر بجا لاتی کہ اتنا اچھا اور محبت کرنے والا ہمسفر اسے نصیب ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی۔

السلام علیکم سائیں ...... بادل خان باہر لان میں آیا تو ستارہ کا باپ شکورا اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور ادب سے اسے سلام کیا۔

وعلیکم السلام۔ کہو شکورے کیسے آنا ہوا؟

سائیں ...... ایک گڑبڑ ہو گئی ہے سائیں ...... وہ میری لڑکی تھی نا ...... ستارہ۔

ہاں کیا ہوا اسے؟ وہ انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

سائیں ...... وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

کیا؟ کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے وہ؟ وہ غصے سے چلایا۔

نہ سائیں نہ ...... میری لڑکی ...... ایسی نہیں ہے وہ کسی کے ساتھ نہیں بھاگی

سائیں وہ تو آپ سے شادی سے انکار کر کے بھاگی ہے۔ اکیلی اللہ جانے کہاں گئی ہے مہینہ ہو گیا ہے سائیں ...... میں نے اسے سارے شہر میں ڈھونڈ لیا پر ملی ہی نہیں۔ وہ مسکین صورت بنا کر بتا رہا تھا۔

ملے گی کیسے وہ تو شروع دن سے مہینے بھر سے میرے پاس ہے۔ بادل خان نے دل میں کہا تو میرے پچاس ہزار روپے واپس کرو اور یہاں سے چلتے بنو۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ سائیں معاف کر دیں۔ میں اسے لڑکی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔

کہاں سے ڈھونڈ نکالو گے۔ مہینہ بھر سے تو ڈھونڈ نہیں سکے۔ اب میں اسے ڈھونڈوں گا۔ دیکھوں گا کہاں جاتی ہے میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم جاؤ یہاں سے تم سے اکیلی چھٹانک بھر لڑکی نہیں سنبھالی گئی۔ اتنی بڑی رقم کا تم نے کیا کیا ہے بولو؟ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

سائیں ...... وہ رقم تو ...... خرچ ہو گئی سائیں ...... وہ شرمندگی سے بولا۔ بڑے شاہ خرچ ہو گئے ہو پچاس ہزار روپے تم نے مہینے میں اڑا دیئے واہ بھئی واہ ...... دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ستارہ نہ ملی تو میں تم سے اپنی ایک ایک پائی نکلواؤں گا اور طریقہ مجھے آتا ہے۔

سائیں ......

جاؤ یہاں سے اور دوبارہ یہاں کا رخ مت کرنا۔ ستارہ ملے یا رقم ملے۔ اب بات ادھر ہی ہو گی جدھر پہلے ہوئی تھی اس شہر کا اور میرے گھر کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔ بادل خان نے اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا۔

جی سائیں ...... رب راکھا سائیں۔ شکور ہاتھ جوڑ کر بولا اور واپس چلا گیا۔

اسٹوپڈ ...... بادل خان نے سر جھٹک کر کہا اور اندر جانے کے لیے مڑا تو ستارہ کو ستون کے ساتھ کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ستارہ کے چہرے پر دکھ نمایاں تھا۔ اوہ تو ستارہ نے سب کچھ سن لیا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا آگے قدم بڑھائے تو ستارہ اندر بھاگ گئی اور بیڈ روم میں آ کر دم لیا۔ بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

میں جس شخص سے بچ کر بھاگی تھی تقدیر مجھے اسی کی پناہ میں لے آئی۔ میرا باپ میرا سودا کر چکا تھا جس کے ہاتھوں وہی میرا سائبان بن گیا۔ بادل نے تو جو کیا سو کیا کہ میرا باپ ہی غیرت سے عاری تھا۔

خود میرے لیے یہ بات کتنی ذلت اور ندامت کا باعث ہے کہ میں ایک خریدی ہوئی لڑکی ہوں۔ وہ بے بسی اور دکھ سے سوچ رہی تھی جبھی بادل خان بیڈ روم میں داخل ہوا۔ وہ نظریں چرا کر رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب آ بیٹھا اور بہت معصومیت سے پوچھنے لگا۔

ناراض کیوں ہو بھئی؟

جیسے آپ جانتے نہیں ہیں ناں ......

تو اس میں ناراضگی کی کونسی بات ہے۔ ہوں ...... بادل خان نے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پیار سے بولا۔ آپ نے اپنے متعلق مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ سب تو اب تک درست نہیں نکلا اور جو بات نہیں بتائی وہ آج سامنے آ گئی۔ کیوں چھپائی آپ نے یہ بات مجھ سے؟

کیوں بتاتا میں تمہیں یہ بات میں تمہیں کسی قسم کی شرمندگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ بات اہم اور ضروری بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا تو اس نے کہا۔ آپ نے میرے باپ کو میری قیمت ادا کی تھی۔ نہیں ستارہ جان ...... وہ قیمت تمہاری نہیں تھی تمہارے باپ کے لالچ کی تھی۔ تم تو انمول ہو ......

تمہارا باپ تمہیں بے مول کر رہا تھا۔ میں اس کی منہ مانگی قیمت ادا نہ کرتا تو وہ تمہیں کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیتا تو کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ میں نے تمہیں پا لیا۔ تم تو مجھ سے بچ کر بھاگ رہی تھیں۔ دیکھو قدرت کا کرشمہ کس طرح تم میری ہی پناہوں میں سمٹ آئیں۔ تم میرے نصیب کا ستارہ تھیں کسی اور آسمان یا بادل پر کیسے چمک سکتی تھیں۔ تمہیں بادل ہی کے سینے پر چمکنا تھا۔ بادل کی وسعتوں سے اس کی پہنچ سے تم باہر نکل جاتیں تو بادل کا کیا بنتا۔ مان لو ...... کہ میرا جذبہ سچا تھا اور

تمہارا نصیب میرے ساتھ ہی لکھا تھا۔ وہ پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''تو آپ نے ابا کو کیوں نہیں بتایا کہ میں آپ کے پاس ہوں؟''

میں اپنے اور تمہارے لیے پرابلمز کریٹ نہیں کرنا چاہتا تھا وہ لالچی آدمی ہے تمہیں میرے پاس دیکھ کر مزید کوئی شوشہ چھوڑ سکتا تھا اور اگر وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو کیا تم چلی جاؤ گی اس کے ساتھ؟

نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی...... وہ گھبرا کر بولی اور اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

تمہیں جانے بھی کون دے گا پگلی...... وہ ہنس کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تو اسے اطمینان ہو گیا۔ یقین ہو گیا کہ بادل خان ہی اس کا نصیب ہے۔

مہینہ تو محبتوں سے بھرپور گزرا تھا۔ بادل خان کی اس ایک بات کے سامنے آنے کی دیر تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے جوہر کھلنے لگے۔ اس کی شخصیت کی پرتیں اترنی شروع ہوئیں تو ستارہ دنگ رہ گئی۔ اس نے جو کہا تھا کہ وہ عورت شراب اور جوئے کا عادی ہے تو چند دنوں میں اس نے یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس کے گھر میں لڑکے لڑکیوں کا جھمگٹا لگا رہنے لگا۔ شراب کے پیگ پر پیگ چڑھائے جاتے۔ اونچی اونچی آواز میں قہقہے لگائے جاتے۔ خراب قسم کی فلمیں دیکھی جاتیں۔ تاش کی بازی لگتی اور جیتنے اور ہارنے والے کو شرطیں پوری کرنا پڑتیں۔ شرطیں بھی ایسی واہیات کہ ستارہ سن کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ اسے بادل خان کے اس روپ سے وحشت اور نفرت ہونے لگی تھی مگر وہ اسے سدھارنے کا جو عہد خود سے اول روز سے کر چکی تھی اس پر اب بھی قائم تھی۔ وہ اس کے گرل اور بوائے فرینڈز سے صرف ایک بار ملی تھی اس کے بعد وہ فوراً اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ بادل خان آدھی آدھی رات تک اپنے کمرے کا رخ نہیں کرتا تھا اور ستارہ نرم بستر پر بھی انگاروں پر لوٹ رہی ہوتی۔ اسے بادل خان کی سنگت میں گزارہ ایک مہینہ خواب لگنے لگتا۔ وہ جو اس پر دل و جان سے ہر لمحہ نثار ہوتا تھا اب

اس سے یکسر بے نیاز ہو گیا تھا۔

شاید بادل خان کا دل بھر گیا ہے مجھ سے اور میں حور پری تو نہیں ہوں......

بادل خان کے گرد تو ہر وقت خوبصورت لڑکیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ جو ماڈرن بھی ہیں۔ ناز و ادا دکھانے والی بھی ہیں۔ بیباک بھی ہیں اور بے تکلف بھی۔ بھلا ان کے ہوتے ہوئے بادل خان کو میری کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ میں تو بس چند دن کی دل لگی تھی ان کے لیے اور بس...... انہیں مجھ میں کشش محسوس ہوئی ہو گی جو اب قربتوں کے چند دنوں میں ختم ہو گئی شاید اور وہ واپس اپنی ڈگر پر چل پڑے۔ میری زندگی میں خوشی کے صرف چند ہی دن تھے۔ وہ دکھ سے سوچ رہی تھی لیکن ستار...... یہ رشتہ چند دن کا تو نہیں ہے عمر بھر کا ہے اور عمر بھر اس طرح نہیں رہا جا سکتا۔ تم بادل خان کو اپنے حسن سے ہی نہیں اپنے صبر سے اپنے پیار اور توجہ سے بھی جیت سکتی ہو۔ وہ بچی قیمت کا بے غرض پیار کا متلاشی اور ترسا ہوا ہے اگر تم اسے یہ سب دو گی تو وہ صرف تمہارا ہو جائے گا۔ جھیل کا خراب پانی صاف کرنے کا وقت آ گیا ہے ستارا اور تم جانتی ہو کہ بادل خان فطرتاً برا انسان نہیں ہے شروع کا ایک مہینہ اس بات کا گواہ ہے۔ اب تمہیں اپنی ذہانت صبر اور محبت سے کام لیتا ہے ستارہ...... اس کے اندر کی ستارہ نے اسے سمجھایا تو وہ نئے عزم کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے دل میں کہا۔

''میں نہ ہاروں گی...... نہ پیچھے ہٹوں گی اور نہ ہی ملاح تبدیل کروں گی میں اپنا بادل اپنے سوا کسی اور کا نہیں ہونے دوں گی کبھی نہیں...... اللہ میری مدد کرے گا''۔

بادل خان کے دوست ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ گولڈی اس کی گرل فرینڈ تھی۔ سکن ٹائٹ سلیولیس ٹی شرٹ اور جینز میں گھرے میک اپ میں وہ بات بات پر بلند قہقہے لگاتی ستارہ کو انتہائی بری لگ رہی تھی۔ مگر اس کی مجبوری تھی۔ اسے ان کے لیے چائے وغیرہ بنا کر لانا پڑی تھی کیونکہ بادل خان نے چند دن پہلے کک اور ملازمہ کی چھٹی کر دی تھی اور سارا کام ستارہ کو کرنا پڑ رہا تھا۔ ستارہ تم کیوں چائے بنا کر لائیں ملازم سے کہہ دیا ہوتا۔

گولڈی نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا تو اس نے بے اختیار بادل خان کی طرف دیکھا جو بے نیازی سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

دراصل لندن میں اسے خود کام کرنے کی عادت تھی اس لیے یہاں آ کر یہ بور ہو گئی تھی ملازموں کے ہاتھ کا کام اسے پسند نہیں تھا سو اس نے ملازموں کی چھٹی کر دی اور خود کام سنبھال لیا ہے''۔

او پوئر گرل...... یہاں یہی تو آسانی ہے ویسٹ میں ہم ملازموں کی عیاشی نہیں کر سکتے۔ میں تو کبھی کچن میں جھانکتی بھی نہیں ہوں۔ تم نے خواہ مخواہ یہ مصیبت اپنے سر لے لی۔ سارا حسن کچن میں جھلس کر رہ جائے گا۔

گولڈی نے ہمدردانہ اور تمسخرانہ لہجے میں کہا ستارہ تو بادل خان کے جھوٹ بولنے پر ہی حیرت زدہ تھی۔ اس کی بات کا کیا جواب دیتی۔

ویسے ستارہ...... تمہاری تو ساری زندگی لندن میں گزری ہے پھر تم نے کسی انگریز سے شادی کیوں نہیں کی ...... بادل خان، میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی تمہیں؟ اب زرقا پوچھ رہی تھی اس سے جو بادل خان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

ان کا بادل ہونا ہی خاص بات ہے۔ بادل جو سب پر یکساں سایہ فگن رہتا ہے۔

ستارہ نے ذو معنی جملہ بولا تو بادل خان پہلو بدل کر رہ گیا۔

ہمارا تو خیال تھا کہ یہ ہم میں سے کسی کو اپنائے گا مگر یہ تو چھپا رستم نکلا کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے دی اور شادی کر لی اور موصوف ابھی تک شادی کی ٹریٹ نہیں دے رہے کہیں تم نے تو منع نہیں کر دیا اسے؟ رخسار نے بڑی ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا۔

''میں بھلا کیوں منع کروں گی یہ اپنی مرضی کے مالک ہیں''۔ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

''تمہیں ڈانس تو آتا ہو گا''۔ گولڈی نے پوچھا۔

''جی...... جی نہیں''۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے ناگواری اس کے چہرے پر ہویدہ تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ لندن میں پلی بڑھی اور تمہیں ڈانس نہیں آتا تمہارے بوائے فرینڈز تو یقیناً ہوں گے۔ گولڈی نے تعجب سے کہا۔

جی نہیں مس گولڈی...... میں ایک مسلمان لڑکی ہوں اور ہمارے مذہب میں لڑکیوں کی لڑکوں سے دوستی ناپسندیدہ فعل ہے۔ غیر مردوں کے گرد منڈلانے والی لڑکیاں اپنی شرم و حیا، نسوانیت اور مذہب کی دھجیاں بکھیرتی ہیں اور مردوں سے دوستی پر بڑا فخر کرتی ہیں۔ گناہ کماتی ہیں ایسی عورتیں۔ ستارہ نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ سب شرمندہ ہی ہو گئیں مگر فوراً ہی سنبھل سی گئیں۔

چچ چچ...... تم لندن کی پیداوار تو نہیں لگتیں وہاں رہ کر یہ خیالات۔ زرقا نے طنز کیا۔

''مسلمان ہر جگہ مسلمان ہی رہتا ہے خواہ وہ لندن کا ہو یا لاہور، کراچی کا رہنے والا ہو۔ جگہ کی تبدیلی سے مذہب کے اصول اور ضابطے تو تبدیل نہیں ہو جاتے''۔ وہ اسی انداز سے بولی تو گولڈی نے کہا۔

تم اس ایک کروڑ روپے کا کیا کرو گی جو تمہارے پاپائے تمہیں شادی پر جہیز کے نام سے گفٹ کیا ہے۔ ہمیں کم از کم ایک لاکھ روپے کی ٹریٹ ہی دے دو۔

ایکسکیوزمی میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ ستارہ نے حیرت سے بادل خان کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ گولڈی نے اس کے جاتے ہی بادل سے کہا۔

بادل یار...... تم نے تو بہت ہی دقیانوسی بیوی ڈھونڈی ہے۔

مغلیہ شہزادی تو لگتی ہے پر بیسویں صدی کے خیالات میں یہ انٹرنیٹ اور کیبل کا دور ہے اور وہ مردوں کی دوستی ناپسندیدہ فعل جیسی باتیں کرتی ہے''۔ زرقا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

مصنوعات کے بدلنے سے مذہب نہیں بدلا کرتا اس کے تقاضے ویسے ہی رہتے ہیں۔ ستارہ نے درست کہا ہے۔ بادل خان نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سب ہنس پڑیں۔ ''لو اس پر بھی بیوی کا اثر ہو گیا''۔ گولڈی نے کہا تو رخسار بولی۔ ایسی سحر زدہ کر دینے والی بیوی لائے ہو ٹریٹ دینے سے کیوں کترا رہے ہو؟''

''ہاں ہم تو کل ہی ٹریٹ لیں گے''۔ زرقا نے کہا۔

ٹھیک ہے تم جس ہوٹل میں کہو گے وہاں تمہیں کل رات کا ڈنر میری طرف سے ''ایز اے ٹریٹ'' ملے گا۔ بادل خان نے کہا تو گولڈی بولی۔

ہوٹل چھوڑ دیا یہاں اپنے گھر میں ہی رکھ لو۔ ہوٹل میں تو بہت ریزرو رہنا پڑتا ہے۔ یہاں ذرا اہلہ گلہ بھی رہے گا۔ ے کا دور بھی چلے گا۔

''او کے ایز یو لائیک'' بادل خان نے کندھے اچکا کر کہا۔

او کے پھر ہم چلتے ہیں کل ملاقات ہو گی ڈنر اور ڈانس پر۔

وہ سب چلے گئے تو وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ ستارہ نماز پڑھ چکی تھی اور دعائیں پڑھ کر اس نے اپنے پر دم کیا تو وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنے قمیض کے گریبان کے اوپری دو بٹن کھول کر ذرا سا آگے کو جھک گیا۔ ستارہ نے اس کے سینے پر بھی پھونک مار دی۔ وہ مسکرا اٹھ گیا۔

''آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'' ستارہ نے جائے نماز تہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

کبھی کسی نے پڑھنے کو کہا ہی نہیں۔ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

اللہ تعالیٰ نے تو کہا ہے نا نماز تو فرض ہے پڑھا کیجیے۔

''اچھا پڑھوں گا''۔ وہ فرمانبردار بچوں کی طرح بولا۔

''کب؟'' اس نے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ بولا۔ جب سیکھ لوں گا۔

تو جلد سیکھیں بادل آپ مسلمان ہیں اور ماشاء اللہ تینتیس برس کے بالغ شخص ہیں نماز سے لاپرواہی اچھی بات تو نہیں ہے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اس نے اشارہ سے سمجھایا تو ایک دم سے وہ غصے میں آتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

تو اس میں میرا قصور ہے کہ مجھے شروع دن سے دینی تعلیم سے دور رکھا گیا۔ یہ والدین کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے مذہب کے مطابق پروان چڑھائیں۔ میرے والدین نے بجائے مجھے کلمہ پڑھانے کے خود اپنی اپنی پسند کے لوگوں سے تین کلمے پڑھوا لیے اور مجھے بیچ منجدھار کے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں جو ہوں جیسا ہوں ٹھیک ہوں تمہیں زیادہ ملانی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تینتیس برس کا بے بہرہ شخص تم تین دن میں صوم وصلاۃ کا پابند بنا دینا چاہتی ہو۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں مت نصیحتیں کیا کرو مجھے''۔

بادل...... پلیز ریلیکس۔ آپ تو سچ مچ گرجنے برسنے لگتے ہیں۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا اسے احساس ہوا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے ایک دم سے سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا حماقت ہو گی اسے تو آہستہ آہستہ پیار سے سمجھانا چاہیے۔ وہ اس لیے ستارہ بیگم کہ بادل میں صرف بارشیں ہی نہیں ہوتیں ...... راکھ کر دینے والی بجلیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ تو کیا میرا بادل مجھ پر بجلی بن کر گرے گا۔ اس نے بہت پیار سے اس کے گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

تم تو خود بجلی ہو۔ جلا کر راکھ کر دیا ہے مجھے۔

اگر راکھ کر دیا ہے تو اس راکھ کو کندن بھی میں ہی بناؤں گی۔

بہت یقین ہے تمہیں خود پر......

''مجھے خود سے زیادہ آپ پر یقین ہے آپ بہت اچھے ہیں''۔

''اب بھی''۔ اس نے کہا۔ تو وہ مسکرا کر بولا۔ ''جی اب بھی''۔

کل وہ سب ڈنر یہیں کریں گے انتظام کر لینا۔ وہ آرڈر دیتا ہوا نظریں چرا گیا۔

''وہ تو میں کر لوں گی مگر آپ یہ بتائیں کہ آپ نے میرے متعلق ان سب سے جھوٹ کیوں بولا؟''

وہ سب پیسے کے پجاری ہیں تمہاری حقیقت بتا دیتا تو وہ تمہارا مذاق اڑاتے جو

مجھے کسی طور گوارہ نہیں تھا۔ اس لیے یہ جھوٹ گھڑنا پڑا۔ اس نے ایمانداری سے بتا دیا۔

آپ واقعی بہت اچھے ہیں بادل۔ تھینک یو ویری مچ۔

ستارہ نے تشکر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحوں تک اس کی صورت تکتا رہا اور پھر آنکھیں موند کر کروٹ بدل لی۔ ستارہ نے کمبل کھول کر اس کے اوپر پھیلا دیا۔ اگلے دن اس نے سارے گھر کی صفائی کی کھانا پکایا تو بری طرح تھک گئی۔ درجن بھر لوگوں کا کھانا تیار کر کے وہ باہر نکل آئی۔ بادل خان نے مالی کو بھی پندرہ دن کی چھٹی دے دی تھی۔ تین دن سے لان کو پانی نہیں لگا تھا وہ پانی کے پائپ لگا کر کیاریوں کو پانی دینے لگی۔ تو صائمہ بھابھی کے بچے یاسر اور انوشا آ گئے۔

"آنٹی ...... آپ ابھی تک کام کر رہی ہیں۔ یہ انکل نے سب ملازموں کی چھٹی کیوں کر دی؟"

آٹھ سالہ یاسر نے پوچھا۔

اصل میں وہ چیک کرنا چاہتے ہیں کہ میں کام کر سکتی ہوں یا نہیں اور یہ بھی کہ کہیں میں آرام و آسائش کی عادی اور دلدادہ تو نہیں ہوگئی۔ میرا دماغ ساتویں آسمان پر تو نہیں پہنچ گیا۔ اس نے گہرا سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

میں سمجھا نہیں آنٹی ...... آپ کو تو کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ یاسر نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ آپ بہت پیاری ہیں بالکل پھولوں کے جیسی ...... اور ویسے بھی اتنے بڑے گھر کو چار پانچ ملازم چلاتے تھے اب سارا کام آپ اکیلی کر رہی ہیں یہ تو ٹھیک نہیں ہے انکل، غلط کر رہے ہیں"۔

جی آنٹی ...... ہم تو آپ کے ساتھ کھیلنے اور باتیں کرنے آئے تھے۔ انوشا نے بھی اس کا دوپٹہ پکڑ کر کہا تو وہ ہنس کر بولی۔ تو بیٹا جانی ...... باتیں تو ہم کر رہے ہیں کھیلنے میں ذرا ٹائم لگے گا پہلے میں یہ کام مکمل کر لوں پھر کھیلیں گے۔

نہیں آپ تھک گئی ہیں اور زیادہ تھک جائیں گی اور پھر مہمان بھی آ جائیں

گے۔ انکل کے کتنی بری بری آنٹیاں یہاں آتی ہیں۔ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔

یاسر نے برا سا منہ بنا کر کہا تو اسے ہنسی آ گئی۔

تو یہ بات تم اپنے انکل سے خود کہنا اور ...... اُف ...... بولتے بولتے اس کا سر بری طرح چکرا گیا۔ یاسر اور انوشا نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

آنٹی ...... کیا ہوا آنٹی؟ دونوں نے گھبرا کر پوچھا۔

سر چکرا گیا ہے میں ٹھیک ہوں۔ وہ لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

بس اب آپ کوئی کام نہیں کریں گی۔ یاسر نے حکم صادر کیا تو اسے اس کی معصوم اور خیال انگیز عادت پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

خوش رہو یاسر بیٹا۔ چندا کام تو کرنا ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

میں مما کو بلا کر لاؤں بھائی۔ انوشا نے پوچھا۔ ہاں ہاں جلدی سے جاؤ۔

نہیں انوشا ...... بیٹا ...... میں ٹھیک ہوں۔ پھر کسی وقت چیک اپ کروالوں گی ابھی مہمانوں کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ ستارہ نے انوشا کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روک دیا۔ آنٹی، ہم کوئی کام کر سکتے ہیں آپ کا۔ یاسر نے پوچھا۔

ہاں آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ میں اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس نے اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

کیا بادل انکل امتحان لے رہے ہیں آپ سے۔

یاسر نے پوچھا تو اس نے کہا۔ "ہاں"۔

آپ ٹاپ کریں گی دیکھ لیجیے گا۔ وہ خوشی سے بولا تو اسے ہنسی آ گئی۔

جیتے رہو، خوش رہو اب دھیان سے گھر جاؤ اور مما کو میرا اسلام کہنا۔

ٹھیک ہے آنٹی، اللہ حافظ ...... وہ دونوں چلے گئے تو اس نے لان میں دوبارہ پانی کا چھڑکاؤ کرنا شروع کر دیا۔ بادل خان کی گاڑی روش پر آ کر رکی تو وہ آخری حصے میں پانی لگا رہی تھی۔ وہ اسے لان میں دیکھ کر وہیں چلا آیا۔

السلام علیکم ...... ستارہ نے اسے سلام کیا مگر اس نے جواب دیئے بغیر اس سے پوچھا یہ تم کیوں لان میں پانی لگا رہی ہو مالی کہاں ہے؟

بھول گئے آپ نے خود ہی تو مالی کو پندرہ دن کی چھٹی دی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا تو وہ خجل سا ہوا مگر ظاہر نہیں ہونے دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

ڈنر کا انتظام ہو گیا یا پودوں کو ہی پانی پلانے پر لگی ہو صبح سے۔

سب انتظام مکمل ہے آپ بے فکر ہو کر تیار ہو جائیے آپ کے کپڑے میں سے پریس کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تم خود بھی اپنا حلیہ درست کر لو، کیا مالیوں جیسا حلیہ بنا رکھا ہے مذاق اڑواتا ہے میرا انہیں دیکھا ہے وہ کیسے تیار ہو کر آتی ہیں۔

وہ جیسے تیار ہو کر آتی ہیں انہیں آپ ہی دیکھ سکتے ہیں مجھ میں تو دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔

وہ سنجیدگی سے بولی تو وہ غصے سے اسے گھورتا اندر چلا گیا۔ ستارہ نے بھی نہا کر نیا لباس زیب تن کیا آسمانی رنگ کے جھلمل ستاروں والے لباس میں ڈائمنڈ کا نیکلس سیٹ پہنے وہ بہت دلنشین لگ رہی تھی۔ اس کی گلابی رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ چہرے کے دلکش نقوش میک اپ سے مزید نمایاں ہو گئے تھے۔ بالوں کو اس نے کھول کر کلپ سے خوبصورت لک دینے کے بعد آخری نظر آئینے پر ڈالی اور اپنی تیاری پر مطمئن ہو کر باہر آ گئی۔ وہ سب لوگ آ چکے تھے۔ اس نے ڈائننگ روم میں برتن تو پہلے ہی سیٹ کر دیئے تھے۔ اب کھانا گرم کر کے میز پر رکھنے کے بعد انہیں کھانے کے لیے بلانے آئی تو گولڈی کو بادل خان کے شانے پر سر رکھے ہنستا دیکھ کر اس کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

نجانے کس قسم کی لڑکیاں ہیں یہ ان میں اپنی عزت آبرو کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے ان کے ماں باپ کو بھی ان کی سرگرمیوں کی خبر نہیں ہے۔ اور بادل ...... کیا مجھے جلانے کے لیے یہ سب محفلیں یہاں سجائی جا رہی ہیں؟ وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ بادل خان کے دوست مظہر کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب آتے ہوئے بولا۔

ارے دنیا کی حسین ترین لڑکی تو یہاں موجود ہے ہم اب تک کہاں وقت ضائع کرتے رہے۔ اُف کیا قیامت حسن ہے۔

کھانا لگ چکا ہے آپ لوگ ڈائننگ ہال میں چلے جائیں۔

ستارہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا اور ایک قہر آلود نظر مظہر اور بادل خان پر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کیا ہو گیا ہے بادل ...... کی غیرت کو کہاں تو انہوں نے غیر ہوتے ہوئے مجھے اس بدنیت ٹکٹ چیکر سے بچایا تھا اس کا مار مار کر حشر کر دیا تھا اور کہاں ...... اپنے گھر میں مجھے اپنی بیوی کی حیثیت سے لا کر اپنے ایک آوارہ دوست کے سامنے اس کی بکواس سننے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ اپنے دوست کا منہ توڑنے کی بجائے گولڈی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے۔ او خدایا ...... یہ سب کیا ہے؟

ستارہ کمرے میں غصے سے ٹہلتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی کہ دھڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور بادل خان اندر داخل ہوا۔ اور اسے دیکھتے ہی غصے سے بولا۔

یہ کیا بدتمیزی ہے مہمانوں کو کھانا سرد کر کے تم یہاں چلی آئیں چلو سب کے ساتھ کھانا کھاؤ آ کر میزبانی کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔

ہونہہ آداب ...... بدتمیزی آپ کو اپنے اس کمینے دوست کی بدتمیزی نہیں دکھائی دی۔ مجھے ایسے فضول مہمانوں کی میزبانی نہیں کرنی وہ آپ کے دوست ہیں آپ ان کے ساتھ کھانا کھائیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ سب کے ساتھ کھانا کھاؤ پھر کوئی اور حکم صادر فرمائیں گے آپ۔ یاد رکھیے مسٹر بادل خان کہ لڑکیوں کی جو قسم آپ کے گرد منڈلا رہی ہے میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔ وہ غصیلے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

اچھا تو پھر اس قدر سجنے سنورنے کی کیا ضرورت تھی رہتیں اسی حلیے میں؟

میں نے یہ سجنا سنورنا صرف آپ کی عزت کی خاطر کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو اپنی عزت کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ طنز اور معنی خیز بات کہہ کر اس کا پارہ آسمان تک لے گئی اور اس کا بھاری ہاتھ اس کے رخسار کو دہکا گیا۔

شٹ اپ ...... میں اس قدر گستاخ لہجے میں بات کرنے کی اجازت کسی کو نہیں

دیتا۔

تو پھر ایسے کام مت کیجیے کہ کسی کو..... آپ کی شان میں گستاخی کرنا پڑے۔

وہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

’’تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا‘‘۔

جی ضرور اس وقت تو جایئے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے کی بجائے اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایئے۔

ستارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ غصے سے باہر نکل گیا اور دروازہ زور سے بند کر گیا جو اس نے بھاگ کر اندر سے لاک کر لیا اور روتی ہوئی بیڈ پر آ گری۔

آپ اچھا نہیں کر رہے بادل..... وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ زبانی کلامی چوٹ تو وہ کب سے کر رہا تھا مگر آج اس نے اس پر ہاتھ بھی اٹھا لیا تھا۔ جبر نے ستارہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ٹرین والا تھپڑ تو بھول گئی تھی مگر یہ تھپڑ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے اپنے آوارہ قسم کے دوستوں کی خاطر اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اپنی بیوی پر جس سے محبت کا اسے دعویٰ تھا۔ جس پر وہ کبھی دیوانہ وار نثار ہوا کرتا تھا۔ آخر اب کیا کمی ہو گئی ہے مجھ میں جو بادل مجھ سے کترانے لگے ہیں۔ مجھے نظر انداز اور ڈی گریڈ کرنے لگے ہیں۔ وہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ روتے روتے وہ وہیں سو گئی۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی اسے نماز قضا ہو جانے کا افسوس ہوا۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ بالوں کی چٹیا بنائی اور باہر آ گئی۔ سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ چکرا رہا تھا۔ اسے بھوک بھی بہت زوروں کی لگ رہی تھی رات بھی وہ کھانا کھائے بغیر ہی روتے روتے سو گئی تھی۔ اس نے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، بادل خان بستر پر آڑھا ترچھا بے سدھ سو رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو چکرا کر رہ گئی۔ رات ان لوگوں نے خوب اودھم مچایا تھا کوئی چیز اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ کشن کہیں تھے تو صوفے کی بیک سیٹس کہیں۔ گلدان کہیں الٹا پڑا تھا تو ایش ٹرے سگریٹوں سے اور شیشے کے گلاس شراب سے گندے ہوئے اِدھر اُدھر اُلٹے

پڑے تھے۔ اسے بہت کوفت ہونے لگی ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر اور وہ کچن میں جا کر پیٹ پوجا کرنے کا ارادہ ترک کر کے ڈرائنگ روم کو اس کی اصل حالت میں لانے کے لیے جت گئی۔ بچوں سے بھی گئے گزرے اور بگڑے ہوئے لوگ تھے کوئی تمیز، تہذیب اخلاق نہیں ہے ان میں ستیاناس کر کے چلے گئے اور بادل پتا نہیں کیسے اتنی گندگی برداشت کرتے ہیں اور خود بھی ان کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ وہ بڑبڑاتی رہی اور کام کرتی رہی۔ آدھے گھنٹے میں اس نے ڈرائنگ روم کی حالت پہلے جیسی کر دی تھی۔ ڈرائنگ روم پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے تمام گلاس اٹھا کر ٹرے میں رکھے اور کچن میں چلی آئی۔ رات کا کافی کھانا دیگچیوں میں بچا رکھا تھا۔ اس نے تھوڑی سی بریانی گرم کر کے پلیٹ میں نکالی اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ ابھی بمشکل تین چار نوالے ہی اس نے حلق سے اتارے تھے کہ اسے قے آ گئی۔ سب کھایا پیا باہر نکل گیا وہ منہ ہاتھ دھو کر نڈھال سی کرسی پر ڈھے گئی۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سر میں بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ سوچ سوچ کر دکھ جو گیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلی آئی وہاں کا حال ڈرائنگ روم سے بھی زیادہ برا تھا۔ کھانے کے برتن ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ اسے تو گندے برتنوں اور کمرے کی حالت دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔ کام کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر کرنا تو اسی کو تھا ورنہ بادل خان اسے آرام پسند ہونے کا طعنہ دیتا جو اسے ہرگز قبول نہیں تھا۔ سو اللہ کا نام لے کر آہستہ آہستہ پہلے برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئی پھر انہیں دھونا شروع کیا ایک گھنٹہ اسے برتن دھونے اور رکھنے میں لگ گئے کچن دھوتے دھوتے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ سردی سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ اس نے پانی گرم کر کے نمک ملا کر پی لیا۔ بھوک شدت سے لگ رہی تھی مگر کھانا حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر کرسی سے سر ٹکا کر وہیں کچن میں بیٹھ گئی۔ دس بج رہے تھے جب بادل خان کمرے سے باہر نکلا ڈرائنگ روم کو چمکتا اور صاف ستھرا دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بھی ستارہ بیگم......لڑکی ہے یا جادو ا کیلی نے سب گند صاف کر دیا۔ محترمہ ہیں کہاں؟ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا کچن تک چلا آیا۔ اور اسے کرسی پر نڈھال اور بے سدھ بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''یہ اتنی پیلی کیوں ہو رہی ہے؟'' اس نے فکرمند ہو کر سوچا۔

'اے محترمہ...... بادل خان نے سپاٹ لہجے میں اسے مخاطب کیا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''جی''۔

آرام ہی ہوتا رہے گا کہ ناشتہ بھی ملے گا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

آپ چلیں میں...... ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔ اس نے گھبرا کر کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے تھکے تھکے وجود میں گہری نگاہ ڈالی اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ ستارہ نے اس کے لیے چائے اور آملیٹ بنایا۔ ڈبل روٹی ٹوسٹر میں سینکی۔ مکھن اور جام جوس فرج سے نکال کر ٹرالی میں رکھا اور ٹرالی کھینچتی ہوئی ڈائننگ روم میں آ گئی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سخت لہجے میں بولا۔ ''اتنی دیر لگتی ہے ناشتہ تیار ہونے میں، میں نے پورا اخبار پڑھ ڈالا ہے اتنی دیر میں''۔

''سوری''...... وہ شرمندہ ہو کر یہی کہہ سکی اور ناشتے کے لوازمات اس کے سامنے ٹیبل پر سجا دیئے۔ اور واپس جانے لگی تو وہ گرجا۔ کہاں جا رہی ہو بیٹھ کر ناشتہ کرو۔

وہ میرا دل نہیں چاہ رہا۔ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

میرے ساتھ ناشتہ کرنے کو...... وہ مزید برہم ہو کر بولا۔

یہ بات نہیں ہے۔ مجھ سے کھایا نہیں جا رہا۔ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

فضول بہانے مت بناؤ۔ بیٹھو اور ناشتہ کرو۔ اس نے غصیلے اور حاکمانہ لہجے میں کہا تو اسے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ کیا تھا اگر بادل...... یہی بات نرمی سے محبت میں کہہ دیتے۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ بادل خان ناشتہ کرتے ہوئے مسلسل اسے اپنی

نظروں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے بمشکل آدھا توس نگلا تھا اور جب تک وہ ناشتہ کرتا رہا اتنی دیر تک وہ جوس گھونٹ گھونٹ کر کے حلق سے اتارتی رہی۔

اس کی گلابی رنگت میں گھلی سرسوں جھیل کنول سی چمکدار سیاہ آنکھوں کی سوجن چہرے پر پھیلی تھکن اور تکلیف بادل خان کو حیران پریشان کر رہی تھی مگر اس نے اپنا رویہ بدلنے کا سوچا بھی نہیں اور سر جھٹک کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

ٹرن......ٹرن......اسی وقت ٹیلی فون کی بیل بجی۔

فون کیا تمہارا باپ سنے گا آ کر، اٹھو فون سنو جا کر۔ اس نے تلخ اور ترش لہجے میں کہا۔ باپ کا طعنہ دے ہی دیا نا آخر...... وہ دکھ سے اسے دیکھتی، سوچتی فون سننے کے لیے اٹھ گئی......''ہیلو''۔

''بادل خان سے بات کراؤ''۔ دوسری جانب ایک بارعب نسوانی آواز تھی۔

''جی آپ کون ہیں؟''

''تم کون ہو؟'' الٹا اس سے سوال کیا گیا تو وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

میں بادل صاحب کی ملازمہ بول رہی ہوں آپ اپنا تعارف کروایئے۔

بادل سے کہو کہ اس کی ممی کا فون ہے اسلام آباد سے۔

''جی بہتر''۔

''آپ کا فون ہے''۔ وہ کارڈلیس لے کر اس کے پاس پہنچی۔

''ظاہر ہے میرا فون ہی ہوگا تمہارا تو نہیں ہو سکتا۔ کون ہے؟'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''آپ کی ممی ہیں''۔

''میری کوئی ممی نہیں ہے۔ بند کرو فون''۔ اس نے غصے میں آ کر کارڈلیس اس سے لے کر آف کر دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ وہ غصے سے اسے گھورتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور تم نے انہیں خود کو میری ملازمہ کیوں بتایا۔ یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم میری بیوی ہو؟'' جب آپ نے انہیں ابھی تک نہیں بتایا تو میں کیسے بتا دیتی اور شاید آپ کو میرا صحیح بتانا بھی برا لگتا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"بہت جاننے لگی ہو تم مجھے ہاں"۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا عین اسی وقت فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ ستارہ نے بادل خان کے غصے سے تمتماتے چہرے کو دیکھا۔

"جی فرمائیے"۔ بادل خان نے تنگ آ کر کارڈلیس آن کر کے کان سے لگالیا۔

"بادل کیسے ہو بیٹا؟" دوسری جانب سے اس کی ممی نے بہت دلار سے پوچھا تھا۔

"میں جیسا بھی ہوں آپ کا بیٹا نہیں ہوں"۔ وہ تلخی سے بولا ستارہ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کیسی باتیں کر رہے ہو بادل ...... اچھا بتاؤ کہ تمہارا بزنس کیسا چل رہا ہے سنا ہے اب تم امریکہ اور فرانس بھی اپنی مصنوعات بھیج رہے ہو۔

"جی درست سنا ہے آپ نے آپ کام کی بات کریں"۔ وہ اسی لہجے میں بولا ان کے فون کے کرنے کا مقصد وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی ہی کسی غرض سے اسے یاد کرتی تھیں۔

تم سلیم کو بھی ایک آدھ ٹینڈر دلوا دو ناں ...... انہوں نے اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے کہا۔

سوری میں یہ کام نہیں کرتا اور کچھ۔ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

اچھا تو اپنے بھائی سرمد کے کراچی میں ایڈمیشن کا بندوبست تو کر سکتے ہو ناں ...... وہ ایس۔ ای۔ ڈی یونیورسٹی میں ایڈمشن لینا چاہتا ہے۔ تمہارے پاس ہی رہے گا وہ آخر کو تم اس کے بڑے بھائی ہو۔ وہ بہت خوشامدی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

بادل خان کو ان پر شدید غصہ آیا۔

میں کسی کا بڑا بھائی نہیں ہوں، نہ ہی میرا کوئی بھائی ہے۔ جب آپ کے گھر میں دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو میں کیوں آپ کے بیٹے کو اپنے گھر میں جگہ دوں۔ مطلبی اور خود غرض خاتون آئندہ مجھے فون کرنے یا مجھ سے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اللہ حافظ ...... بادل خان نے غصے سے اپنی بات مکمل کی اور فون بند

کر کے نیچے پٹخ دیا۔ ستارہ کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے غصے میں تو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا مگر اس وقت غصے سے جو اس کی حالت ہو رہی تھی وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی اور ڈر رہی تھی۔ بادل خان نے اسے اپنی جانب دیکھتے پایا تو غصیلے اور ہتک آمیز لہجے میں بولا۔ "تم کیا کھڑی کھڑی میرا منہ تک رہی ہو۔ یہ برتن اٹھاؤ یہاں سے ملکہ عالیہ...... نوکروں کی فوج لے کر نہیں آئی تھیں تم جہیز میں جو مزے سے کھڑی ہو"۔

اُف میرے اللہ ...... میرا ماضی میری معاشی حیثیت بھی اب میرے لیے طعنہ بنی رہے گی۔ اس قدر ہتک پر ستارہ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ خاموشی سے برتن سمیٹنے لگی۔ بادل خان کسی کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ برتن کچن میں لے جا کر دھو کر رکھ چکی تو اپنے آپ کو مضبوط بناتی ہوئی بادل خان کے مخصوص کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا میز پر ٹانگیں رکھے ہاتھ میں بیئر کا پیگ اٹھائے وہ ابھی تک غصے میں جل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ ستارہ کی تو اپنی حالت قابل رحم تھی وہ اسے کیسے سنبھالتی؟ کیسے کول ڈاؤن کرتی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو واپس جانے لگی۔ اسی وقت بادل خان نے اسے آواز دے کر اس کی جان نکال دی۔

"ستارہ ...... جانے کے لیے آئی تھیں کیا؟"

جی ...... نہیں تو ...... میں آپ کو ...... وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے بولی۔

"ادھر آؤ" ...... بادل خان نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ ڈرتی ہوئی صوفے کے قریب آ گئی۔

"جی" ...... وہ بولی تو اس نے حکم دیا۔ "ٹیبل پر گلاس رکھا ہے اس میں بیئر ڈالو اور میرے ساتھ بیٹھ کر پیئو"۔

بادل ...... وہ ہراساں اور پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

یہ میرا حکم ہے ستارہ بیگم...... اس نے اسی رعب اور حاکمانہ انداز میں کہا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن بادل ...... اس سے کیا ہوگا؟" وہ ہمت کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے بیئر والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر نرمی اور اپنائیت سے بولی۔

"ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا"۔

تو کیا ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک ماں اپنے پانچ چھ برس کے بیٹے کو چھوڑ کر چلی جائے اسے اپنی ممتا اور محبت سے محروم رکھے اور باپ اپنے بیٹے کو نوکروں کے حوالے کر کے خود رنگ رلیاں مناتا پھرے۔ بولو کیا ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"نہیں" ...... اس نے لاجواب ہو کر کہا۔ تو وہ اسی لہجے میں بولا۔ تو جب میرے ماں باپ نے مذہب کی پرواہ نہیں کی تو میرے لیے یہ پابندی کیوں؟

بادل ...... ستارہ کی جان ...... آپ تو بہت اچھے ہیں، آپ کے بڑوں نے اچھا نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آپ بھی ان جیسا رویہ اپنالیں۔ یوں غصے ہو کر جل کڑھ کر تو آپ اپنی ہی صحت برباد کر رہے ہیں اور جو آپ پی رہے ہیں۔ کتنا مضر صحت ہے کچھ اندازہ ہے آپ کو۔ وہ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ تو کسی کو کیا فرق پڑتا ہے میری صحت کے برباد ہونے سے۔ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "کسی کو نہ پڑتا ہو۔ لیکن مجھے تو فرق پڑتا ہے۔ میرا تو سب کچھ آپ ہیں۔ میرا پیار میرا اعتبار میری پناہ گاہ سبھی کچھ آپ ہیں اور میں آپ کو اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ بادل جانی، خود کو دوسروں کے غلط رویوں کی وجہ سے ضائع مت کریں"۔ وہ بہت محبت سے دھیرے دھیرے اس کا غصہ ختم کرتی جا رہی تھی۔ جانتی ہو ستارہ ...... میری ماں نے مجھے دوسرے شوہر کو آرڈر دلوانے اور بیٹے کو یونیورسٹی میں داخلہ دلوانے کی غرض سے فون کیا تھا۔ اس نے کبھی میری خیریت معلوم کرنے کے لیے مجھے فون نہیں کیا۔ وہ چاہتی ہے کہ میرا سوتیلا بھائی میرے ساتھ اس گھر میں رہے۔ میں نے صاف منع کر دیا۔ کیوں رکھوں میں اس عورت کے بیٹے کو اپنے گھر میں جس کے گھر میں اپنی سگی اور بڑی اولاد کے لیے

کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ گھر یہ "بادل ہاؤس" میرا ہے میں نے دن رات محنت کر کے اپنی کمائی سے اسے تعمیر کرایا ہے۔ اس پر صرف میرا حق ہے۔ جب انہوں نے مجھے کچھ دیا ہی نہیں سوائے محرومیوں اور دکھوں کے تو ...... میں کیوں انہیں ملکیت کا حق دوں۔ یہ سب کچھ میرا ہے میں نے کمایا ہے۔ میرا ان لالچی اور خود غرض لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ کرب، دکھ اور اذیت آمیز لہجے میں بولا ستارہ کو اس پر بے حد پیار آیا۔ اس کے کردار کی خرابیاں تو دراصل اس کے والدین کی لاپرواہیاں تھیں۔ جو اسے سب سے حتیٰ کہ خود اپنی ذات تک سے بدگمان اور لاپرواہ بنا گئیں تھیں۔ تو اس مضر صحت مشروب سے رشتہ کیوں جوڑ رکھا ہے چھوڑ دیں اسے"۔

ستارہ نے بیئر کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتے ہوئے کہا وہ حیران تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ اس کی تذلیل کر کے آیا ہے اسے تنقید اور طنز کا نشانہ بنا چکا ہے اور وہ پھر بھی اسے اتنی محبت سے سمجھا رہی ہے۔ اس کا دکھ بانٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتنا حوصلہ اتنا ظرف کہاں سے آ گیا تھا اس میں اس نوخیز اور کم عمر لڑکی میں جو اپنے سے تیرہ برس بڑے مرد کو اس اپنائیت و محبت سے کول ڈاؤن کر رہی تھی ...... اس کی دلجوئی کر رہی تھی۔

"جنہوں نے آپ سے اپنا رشتہ توڑ لیا، اور جنہیں آپ اپنے لیے زندہ نہیں سمجھتے پھر ان کی وجہ سے خود کو اس گناہ اس تکلیف اور اذیت سے کیوں دوچار کر رہے ہیں؟ وہ اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے شیریں لہجے میں بول رہی تھی۔ بادل خان کو بہت مسرور اور سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بس اسے دیکھے اور سنے جا رہا تھا۔

بادل ...... جنہیں آپ کی پرواہ نہیں ہے آپ ان کی وجہ سے اپنی صحت اور شخصیت سے لاپرواہی کیوں برت رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو انہیں کیا فرق پڑے گا، ان کی زندگیوں میں کونسا کوئی ٹھہراؤ یا کمی واقع ہو جائے گی۔

بلکہ شاید وہ تو شکر ادا کریں گے کہ ایک نام نہاد ذمہ داری سے جان چھوٹ گئی۔ آپ نے خود بتایا ہے کہ وہ لالچی ہیں خود غرض اور مطلبی ہیں تو جان وہ آپ کی دولت اور جائیداد پر قبضہ کرنے ہی آئیں گے ناں یہاں...... انہیں کیا فرق پڑے گا آپ کے ہونے یا نہ ہونے سے۔

''اس لیے تو کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود کو شوٹ کرلوں''۔ وہ دکھ سے بولا۔

''نہیں ایسا ہرگز نہیں کریں گے آپ''۔ وہ تڑپ کر اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہ فطری سی بات ہے لیکن بادل، جب وہ لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو چکے ہیں تو آپ کیوں ان کی وجہ سے اپنی زندگی بے سکون کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے بادل، کہ انسان کو سب کچھ نہیں ملتا۔ سب کے پیار اور توجہ کا حصہ نہیں ملتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انسان زندگی کی خوشیاں خود پر حرام کرلے۔ آپ کو زندہ رہنا ہے زندہ دلی اور حوصلے کے ساتھ۔ اس لیے کہ اب بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صریحاً آپ سے پیار کرتے ہیں''۔

''مثلاً...... وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا''۔

''اگر آپ یقین کریں تو میں ہوں''...... اس نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تم نے ایک بار کہا تھا کہ ہر شخص کی دوسرے شخص سے کوئی نہ کوئی غرض اور لالچ بندھی ہوتی ہے تمہاری مجھ سے کیا غرض اور لالچ ہے؟

میری غرض تو بس آپ کا پیار اور پناہ ہے اور تو کوئی لالچ نہیں ہے مجھے آپ سے۔

''میں نہیں مانتا''...... اس نے ہٹ دھرمی سے کہا دل میں تو کہیں بہار آ گئی تھی۔

''میں منوالوں گی ایک دن''...... اس نے مسکراتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔

''مجھے اکیلا چھوڑ دو''...... وہ نظریں چرا کر بولا جیسے اسے خدشہ ہو کہ وہ سچ مچ اس سے اپنا آپ منوالے گی اور ایسا تو وہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ وہی انجان بنا رہا تھا۔

''تاکہ آپ پھر سے ڈرنک شروع کر دیں''۔

''تم جاتی کیوں نہیں ہو یہاں سے''۔ وہ چلایا۔

''کہاں جاؤں گی میں میری واحد پناہ گاہ تو آپ ہیں بادل''۔ اس نے بے بسی اور محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اُلجھ گیا اور خود ہی اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ستارہ نے طویل سانس لبوں سے خارج کیا اور بیئر کا گلاس اور بوتلیں اُٹھا کر ضائع کر دیں۔ اگلے دن بادل خان آفس سے جلدی گھر آ گیا وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ستارہ نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ مگر پوچھنے کی جسارت نہ کر سکی۔

''ستارہ...... ادھر آؤ''۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''جی''۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس چلی آئی۔ ''بیٹھو ادھر'' وہ بیٹھ گئی تو اس نے کہا۔

''تمہارے لیے ایک بری خبر ہے''۔

''میرے لیے...... بری خبر''۔ وہ حیرت سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ ایسی خبریں کس طرح سنائی جاتی ہیں میں تمہیں یہ خبر سنانا بھی نہیں چاہتا تھا
لیکن...... مجبوری ہے خبر سنانا بھی ضروری ہے۔

''کیسی خبر؟''۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''پرسوں تمہارے ابا کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا''۔

''کیا؟''...... وہ صدمے سے بے اختیار چیخ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہاں ستارہ...... تمہارے ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے مجھے کوئٹہ سے میرے آدمی نے فون کیا تھا اسی نے بتایا ہے''۔ اس نے تفصیل بتائی۔

کتنی بدنصیب ہوں باپ ملا بھی تو کیسا اور مرا بھی تو کیسے کہ میں ...... اس کا منہ بھی نہیں دیکھ سکی۔ ستارہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

صبر کرو ستارہ ...... ایسے باپ سے تو تم یتیم ہی بھلی اور یتیم تو تم اسی دن ہو گئی تھی جس دن اس نے تمہاری قیمت وصول کی تھی۔ بادل خان نے اسے شانوں سے پکڑ کر بیٹھا دیا اور اسے سمجھانے لگا۔

تمہارے سر پر بھی ہر وقت ایک تلوار لٹکتی رہتی تھی کہ ابا آگئے تو کیا ہوگا سو اب وہ تلوار باقی نہیں رہی۔ مجھے تمہارے باپ کی موت کا دکھ ہے مگر کاش ...... کہ وہ باپ بن کر دکھاتا، بیوپاری نہ بنا ہوتا۔ چپ کرو ستارہ ...... صبر کرو"۔

وہ اسے اپنے ساتھ لگائے دلاسہ دے رہا تھا وہ روئے جا رہی تھی۔ جیسا بھی تھا اس کا باپ تو تھا ناشکور اور دکھ فطری تھا۔

ایسے ہی لوگ ہوتے جن کی قبریں دعاؤں کو ترستی رہتی ہیں۔

بادل خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ سر اٹھا کر بولی۔

نہیں بادل خان ...... میرے ابا کی قبر دعاؤں کو نہیں ترسے گی۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں اپنے ابا کی مغفرت کے لیے دعا کروں گی۔ قرآن خوانی کراؤں گی۔ آپ کرائیں گے ناں، قرآن خوانی کا انتظام؟"۔

ٹھیک ہے میں ابھی کہلوا دیتا ہوں کل صبح مسجد میں تمہارے ابا کے لیے قرآن خوانی کا بندوبست ہو جائے گا۔ تم ہمت سے کام لو تمہاری طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ رو رو کے مزید خراب کر لوگی"۔ اس نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا اسے اس کی طبیعت کا خیال اچانک کیسے آگیا تھا۔ وہ چند دن تو اس کی دلجوئی کرتا رہا اس کے غم کے باعث اور چند دن بعد پھر سے اسے نظر انداز کرنے لگا اس کی طرف سے بے نیاز اور لاپرواہ ہو گیا اور وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔

بادل ...... آپ کیوں مجھ سے لاپرواہی برت رہے ہیں۔ پل پل مجھے کیوں آزما رہے ہیں؟

ستارہ نے دکھی ہو کر اسے اپنے دل میں مخاطب کر کے کہا۔

"ہائے ستارہ ...... کیسی ہو ڈارلنگ؟" زرقا اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی چہکی تو وہ چونک گئی ڈسٹنگ کرتے ہوئے رک گئی اور اس کی طرف اخلاقاً مسکرا کر دیکھا۔ ہیلو زرقا جی ...... کیا حال ہیں آپ کے؟"۔

...... ایک دم زبردست تم سناؤ یہ کیا ماسیوں والے کام کرتی پھر رہی ہو۔ قسم سے تمہارا حسن تو شوکیس میں سجانے کے لائق ہے اور اس بادل کے بچے نے تمہیں جھاڑو پوچے پر لگا دیا ہے۔ تمہیں برا نہیں لگتا یہ سب کام کرنا۔ وہ صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔

برا کیوں لگے گا یہ تو ہر عورت کا فرض اور ذمہ داری ہے گھر کے کام عورت ہی کو زیب دیتے ہیں۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

پھر بھی اتنے بڑے بنگلے کی صفائی، کوکنگ اور باقی کام مشکل تو ہوتی ہو گی تمہیں۔

"آپ میری مشکل کی فکر چھوڑیں یہ بتائیں کہ کیسے آنا ہوا؟"۔

"ہاں خوب یاد دلایا"۔ وہ اُچھل کر بیٹھ گئی اور اپنے پرس میں سے ایک ڈبہ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ "یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں؟"۔

ڈائمنڈ سیٹ بہت خوبصورت ہے۔ ستارہ نے ڈبہ کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔ تم سے زیادہ نہیں ہے چلو دو لاکھ کا چیک کاٹو اور یہ سیٹ اپنے پاس رکھو۔

"دو لاکھ کا چیک مگر مجھے تو اس سیٹ کی ضرورت نہیں ہے"۔

"بھئی جب پسند ہے تو ضرورت کیوں نہیں ہے؟"۔ زرقا نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں ہے زرقا جی، کہ جو چیز پسند ہو وہ پاس بھی ہو۔ اور مجھے جیولری کا ویسے بھی کوئی خاص شوق نہیں ہے مجھے جیولری کے ڈیزائن اچھے لگتے ہیں۔ میرے پاس تو ڈائمنڈ سیٹ آل ریڈی موجود ہے۔ مجھے بادل نے گفٹ کیا تھا۔

"چلو پھر یہ میری طرف سے گفٹ سمجھ کر رکھ لو"۔

"ارے نہیں زرقا جی، میں اتنا مہنگا گفٹ نہیں لے سکتی"۔

''بادل کی بیوی ہو تمہارے پاس روپے پیسے کی کیا کمی ہے چاہو تو یہ سیٹ دس لاکھ میں بھی خرید سکتی ہو''۔ زرقا نے اسے اُکسانے کی کوشش کی تو وہ ہنس کر بولی۔

''کیوں زرقا جی، میرے شوہر کی حرام کی کمائی ہے جو میں ان چیزوں پر خرچ کروں۔ بادل، دن رات محنت کرتے ہیں میں ان کی حق حلال اور محنت کی کمائی اس طرح نہیں لٹا سکتی آپ تو دو لاکھ روپے کی بات کر رہی ہیں اور میں اپنے شوہر کی کمائی کے دو روپے بھی فضولیات پر خرچ کرنا پسند نہیں کروں گی''۔

عجیب لڑکی ڈھونڈی ہے بادل نے کوئی خرچہ نہیں، فرمائش نہیں، شوق نہیں، ملازم نہیں، آل اِن وَن ...... واہ بھئی مگر خیال رکھنا کہیں خود خرچ نہ ہو جانا میں اب چلتی ہوں۔

زرقا نے مایوس ہو کر ڈبہ واپس پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں''۔

''ارے نہیں، چائے کا موڈ بن سکتا تھا اگر تم یہ سیٹ قبول کر لیتیں''۔

''سوری'' ...... وہ مسکرائی۔ ''اوکے بائے''۔ وہ کندھے اُچکا کر بولی اور جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس بھی چلی گئی۔ وہ دوبارہ کام میں لگ گئی ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ بادل خان کے دوست مظہر ٹونی اور جاوید آگئے۔

''بادل تو گھر پر نہیں ہیں''۔ ستارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہمیں معلوم ہے بھابھی جی، بادل باہر ہیں اور آج تو برسنے کے موڈ میں بھی ہیں۔ ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں''۔ جاوید نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''سوری میں مصروف ہوں آپ بادل کی موجودگی میں گھر آئیے گا اب جا سکتے ہیں آپ''۔ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

بادل، کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے ہم تو پہلے بھی اس کی غیر موجودگی میں یہاں آتے رہے ہیں۔ آپ تو حد ہی کر رہی ہیں''۔ مظہر نے اسے بری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حد تو آپ لوگ کراس کر رہے ہیں تشریف لے جائیں یا باہر بیٹھ کر بادل کا انتظار کریں''۔ ستارہ نے غصیلے اور سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنے بیڈ روم

میں جا کر اندر سے لاک لگا لیا۔

''یار یہ لڑکی تو واقعی وکھری ٹائپ کی ہے''۔ مظہر نے ٹونی اور جاوید سے کہا۔

''کھل جائے گی آہستہ آہستہ فکر کیوں کرتے ہو''۔ ٹونی نے کہا۔

''اور اگر نہ کھلی تو''۔ جاوید نے کہا۔

''تو ہم خود کھول لیں گے''۔ مظہر نے کمینگی سے کہا ان کی آوازیں اور قہقہے ستارہ کو اپنے کمرے میں بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ سن ہو کے رہ گئی۔ اسے اپنے ہی گھر میں عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو پریشانی سے وہ کمرے میں ٹہلتی رہی پھر تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کی طبیعت بھی آج کل بوجھل سی رہنے لگی تھی۔ ذرا سا کام کرتی تو تھک جاتی۔ سر چکرانے لگتا۔ بھوک لگتی مگر کھایا ہی نہیں جاتا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہ رہی تھی مگر کس سے کہتی کس کے ساتھ جاتی۔ صائمہ بھابھی اپنے کلینک میں مصروف رہنے کے باعث اس کی طرف نہیں آ سکتی تھیں اور وہ بادل سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی وہ تو فوراً اسے نازک مزاج ہونے کا طعنہ دے دیتا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ نہا دھو کر تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا خیال تھا کہ مظہر، ٹونی اور جاوید وغیرہ چلے گئے ہوں گے۔ اس کا خیال کسی حد تک درست بھی تھا۔ کیونکہ ڈرائنگ روم میں تو اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ اخبار اُٹھا کر بیٹھی ہی تھی کہ جاوید سامنے آگیا۔

''آپ ابھی تک یہیں ہیں''۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی تھی اس لیے مظہر اور ٹونی کو باہر چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ شکر ہے آپ کمرے سے باہر تو نکلیں۔ آخر آپ اس قدر پردہ نشین، گوشہ نشین کیوں ہیں۔ دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ؟''۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر''۔ وہ غصے سے سلگ کر بولی۔

''چلا جاؤں گا ستارہ جی ...... مگر آپ سے دو چار باتیں کرنے کے بعد آخر آپ بادل کے لیے خود کو ضائع کیوں کر رہی ہیں؟''۔ وہ اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ستارہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

''اب دیکھوناں...... تم اس قدر حسین و دلنشین ہو کہ بندہ کسی اور طرف دیکھنے کا سوچنے کا بھی نہ مگر بادل خاں، رنگ رنگ کی تتلیوں کے جھرمٹ میں مگن رہتا ہے۔ آپ کا حسن اس کی بے نیازی کی نذر ہو رہا ہے وہ ایک عورت سے گزارہ کرنے والا آدمی نہیں ہے، بہت ہی شوقین اور آوارہ مزاج آدمی ہے''۔

''پھر تو تم بھی ایسے ہوئے نا، تم بھی تو بادل کے دوست ہو''۔ ستارہ نے طنز سے کہا۔ ''ہوں لیکن ناقدرہ نہیں ہوں تمہارے حسن کا مجھ جیسا قدردان ساری دنیا میں نہیں ہوگا۔ بادل، نے تو تمہیں نوکرانی، بنا کر رکھا ہوا ہے اسے خوبصورت ملازمہ بھی مل گئی ہے اور اپنی عیاشی بھی جاری ہے۔ میں تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا میری مانو تو بادل سے جان چھڑا لو۔ کیا دے سکتا ہے وہ کمینہ تمہیں''۔

''بکواس بند کرو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے''۔ ستارہ نے غصے سے بے قابو ہو کر اس کے گال پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ ایک لمحے کو تو حواس باختہ ہو گیا۔ خود ستارہ کو بھی یقین نہ آیا کہ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے ہٹے کٹے مرد کو تھپڑ جڑ دیا تھا۔ ہمت دکھائی تھی تو اسے قائم بھی رکھنا تھا۔

''یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا ستارہ ڈارلنگ''۔ وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک تو میں تمہیں ایسا کراؤں گی کہ یاد کرو گے نکل جاؤ میرے گھر سے۔ چوکیدار، چوکیدار جلدی آؤ ادھر''۔ وہ چیخ کر چوکیدار کو آواز دینے لگی۔ ''دیکھ لوں گا میں تمہیں''۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھمکی دی۔ خبردار...... جو آئندہ مجھے دیکھنے کی کوشش کی، تمہاری آنکھیں نکلوا کر چیلوں کے آگے ڈلوا دوں گی دفعہ ہو جاؤ یہاں سے''۔ وہ غصیلے اور تیز لہجے میں بولی میز پر رکھا سنگ مرمر کا ایش ٹرے اور گلدان اس نے احتیاطاً اٹھا لیا تھا۔ ہتھیار کے طور پر۔

''جی بیگم صاحبہ...... چوکیدار بھاگا چلا آیا''۔

جاوید صاحب کو باہر کا راستہ دکھاؤ اور آئندہ انہیں یا بادل کے ان آوارہ دوستوں کو اندر مت گھسنے دینا ورنہ تمہاری چھٹی کروا دوں گی''۔

ستارہ نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

جو حکم بیگم صاحبہ...... اب کوئی نہیں آئے گا۔ چلیں صاحب ہماری نوکری کا سوال ہے''۔ چوکیدار نے جاوید کا بازو پکڑ کر کہا اور اسے باہر لے گیا وہ بہت خطرناک نظروں سے ستارہ کو گھورتا ہوا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ نے ڈرائنگ روم کا بڑا سا منقش لکڑی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور صوفے پر ڈھے گئی۔ اس کا سارا بدن خوف اور نقاہت سے کانپ رہا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی تھی۔ چوکیدار کا کیا بھروسہ تھا وہ بھی تو ایک مرد ہی تھا۔ اسے جتنی قرآنی سورتیں یاد تھیں۔ اس نے پڑھ کر اپنے اوپر پھونک لیں۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھی تھی پون گھنٹے بعد دروازہ کھٹکا تو اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ کئی بار دروازے پر دستک ہوئی مگر وہ خوف کے مارے اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔

دروازہ کھولو ستارہ...... بادل خان کی بلند اور گرجدار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اسے کچھ اطمینان ہوا اور وہ ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ بادل خان نے اس کے خوفزدہ سراپے کو گہری نظروں سے دیکھا اور اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ میں کتنی دیر سے دروازہ پیٹ رہا ہوں سوئی رہتی ہو ہر وقت اور اندر کا دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟۔

''مجھے ڈر لگ رہا تھا''۔ وہ پھر سے دروازہ لاک کر کے اس کے پیچھے آتے ہوئی بولی۔

''کس سے؟''۔ بادل خان نے مڑ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

''آپ کے شیطان صفت دوستوں سے''۔

''واٹ؟''۔ وہ بھڑکا۔ ''ایک تو گھنٹہ بھر میرے دوست یہاں اکیلے بیٹھے رہے اوپر سے تم انہیں شیطان صفت کہہ رہی ہو۔ ابھی مجھے جاوید نے فون کیا تھا۔ بجائے انہیں اینٹرٹیمن کرنے کے تم نے انہیں بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ اور یہاں آنے سے منع کر دیا اور تو اور جاوید کو تھپڑ بھی دے مارا۔

''وہ تھا ہی اس قابل''۔ ستارہ نے غصے میں آتے ہوئے کہا۔ اور آپ نے

مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں کوئی مداری ہوں۔ طوائف ہوں یا داشتہ ہوں آپ کی اور یہ آپ کا گھر ہے یا کوئی بالا خانہ...... جو میں آپ کے دوستوں کو اینٹرٹین کروں...... بادل خان صاحب۔ میں بیوی ہوں آپ کی کوئی اینٹرٹیز نہیں ہوں۔

''بکواس بند کرو''۔ وہ چلایا۔

''آپ نے بات شروع کی ہے تو آپ کو میری بکواس بھی سننا پڑے گی اور یاد رکھیں بادل خان، میں اگر اپنی عزت بچانے کی خاطر اپنے باپ کے گھر سے بھاگ سکتی ہوں تو...... اپنی عزت کی خاطر میں اپنے شوہر کے گھر سے بھی بھاگ کر جا سکتی ہوں''۔ وہ سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کیا کہا تم نے؟''۔ بادل خان نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''کہاں جاؤ گی بھاگ کر تمہیں اپنے باپ جیسے ہزاروں باپ مل جائیں گے۔ بھاگ کر جاؤں گی تم میں تمہیں...... ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گری۔

ستارہ...... بادل خان نے حیرت سے پہلے اسے اور پھر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر اسے اچانک کیا ہو گیا تھا۔ جو وہ یوں اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر جا گری تھی۔ اس نے جھک کر اس کی کلائی تھام کر نبض چیک کی جو بہت مدھم تھی۔

اس کے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا تو اسے دل کی دھڑکن سنائی دی نہ محسوس ہوئی وہ گھبرا گیا۔ ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔

''ستارہ...... یہ تمہارا دل کہا گیا۔ اُٹھو لڑکی، کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے؟''۔

وہ اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ مگر وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مائی گاڈ، کیا کروں میں؟۔ وہ پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا اور پھر ستارہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے آیا اور بیڈ پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گال تھپتھپائے مگر اسے ہوش نہیں آیا۔ اب تو بادل خان کی حالت قابل رحم تھی۔

''ستارہ...... ستارہ...... آنکھیں کھولو یار...... تمہیں پتہ ہے نا میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ پلیز ستارہ ہوش میں آؤ''۔ وہ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھامے اس سے مخاطب تھا۔ وہ اپنی کی کوششوں سے ہوش میں نہ آسکی تو اس نے صائمہ بھابھی کو فون کر کے بلایا۔

''بھابھی...... کیا ہوا ہے ستارہ کو؟'' صائمہ بھابھی اس کا چیک اپ کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلیں تو اس نے بیتابی سے پوچھا۔

''اس کا بی پی لو ہو گیا ہے۔ وہ مسلسل ٹینشن اور ذہنی دباؤ میں خوفزدہ بھی ہے۔ اور کمزوری بھی ہے۔ آخر آپ کیا سلوک کر رہے ہیں اس کے ساتھ جو گلاب جیسی ستارہ کملا کر رہ گئی ہے۔ ملازموں کی آپ نے چھٹی کر دی ہے کیا آپ ستارہ کو ملازمہ بنا کر لائے تھے؟۔ صائمہ بھابھی نے اس کی خبر لیتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

بھابھی میں تو......

آپ نہ تو اس کا خیال رکھ رہے ہیں اور نہ ہی اسے خوش رکھ رہے ہیں وہ دن بھر جو آپ کے گھر میں ماسیوں کی طرح کام کرتی پھرتی ہے نا اس کی خبریں مجھے بچوں کے ذریعے ملتی رہتی ہیں۔ اب ستارہ کی حالت دیکھ کر یقین بھی آ گیا۔ افسوس...... بادل بھائی آپ جیسے ایجوکیٹڈ بندے کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔ قدر کریں اس کی ماشاءاللہ حور شمائل بیوی ملی ہے آپ کو اور سیرت بھی کمال کی ہے اس کی۔

صائمہ بھابھی نے اس کی بات کاٹ کر کہا وہ مزید نادم ہو گیا۔

''آپ بتایئے بھابھی، میں کیا کروں؟''

ستارہ کا خیال رکھیں اسے خوشی دیں غم نہ دیں اس کی خوراک کا خیال رکھیں۔

''سب کچھ تو موجود ہے گھر میں، میں نے اسے کھانے پینے سے روکا تو نہیں ہے''۔

آپ نہیں سمجھیں گے سمجھ سکتے تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ دل کی خوشی سے ہر بات وابستہ ہوتی ہے دل خوش نہ ہو تو کھانا بھی نہیں کھایا جاتا۔ آپ ستارہ، کو کل میرے کلینک لے کر آیئے گا اس کے چند ضروری ٹیسٹ کروانے ہیں''۔

''ٹیسٹ مگر کس لیے؟''۔اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی ٹیسٹ کا نام سنتے ہی۔

''یہ میں آپ کو ٹیسٹ رپورٹس دیکھنے کے بعد بتاؤں گی۔ فی الحال اسے یہ ٹانک منگوا کر پلائیں اور غذا کا خاص خیال رکھیں''۔صائمہ بھابھی نے دوا کا نسخہ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئیں۔اس نے ڈرائیور کو نسخہ دیا اور دوا لانے کے لیے بھیج دیا۔خود کمرے میں آیا تو ستارہ کو حرکت کرتے دیکھا۔ستارہ، ہوش میں آؤ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''۔وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

بادل...... ستارہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے پکارا۔

بادل کے برسنے سے پہلے ہوش میں آجاؤ ستارہ...... اس نے ذومعنی بات کہی۔

''پانی''۔وہ خشک حلق سے کمزور آواز نکال سکی۔

''پی لو اُٹھ کر میں ملازم نہیں لگا ہوں تمہارا''۔وہ درشتی سے کہتا اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

''بادل ہو کر بھی پانی...... نہیں دے سکتے۔کیسے بادل ہیں آپ؟''۔وہ ٹھہر ٹھہر کر مسکرا کر بولی۔

''تم ہی کہتی ہو کہ آپ بہت اچھے ہیں''۔اس نے یاد دلایا۔

''وہ تو میں۔اب بھی کہتی ہوں''۔اس نے مدھم سی مسکان لبوں پر لا کر کہا۔

''بیہوش کیوں ہوئی تھیں؟''۔وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

پتہ نہیں شاید ہمت جواب دے گئی تھی۔اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

ڈرائیور دوا لینے گیا ہے لے آئے تو ہر کھانے کے بعد پی لینا۔میں کیا تمہیں کھانے پینے کو نہیں دیتا کس چیز کی کمی ہے اس گھر میں جو تم مجھے صائمہ بھابھی کے سامنے شرمندہ کرا رہی ہو؟''

صائمہ بھابھی...... مگر میں نے تو ان سے...... کچھ نہیں کہا میری تو ان سے بہت دنوں سے ملاقات بھی نہیں ہوئی''۔وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

بلایا تھا میں نے انہیں آپ کے چیک اپ کے لیے۔وہ مجھے خوب سنا کر گئی ہیں

تمہاری حالت دیکھ کر۔بہت ظلم کر رہا ہوں ناں میں تم پر...... بیگار لے رہا ہوں تم سے ہے ناں...... ''میں نے تو آپ سے کوئی شکوہ نہیں کیا''۔وہ رسمی ہو کر بولی۔

''تمہاری حمایت میں بولنے والے موجود ہیں''۔وہ طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولا۔

پلیز بادل...... وہ کمزور لہجے میں بولی اور سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پانی پیا اور گلاس واپس رکھ کر نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی اور کمبل گردن تک کھینچ لیا۔بادل خان دیکھ رہا تھا اس کی حالت اندر ہی اندر بے چین ہو رہی تھی۔مگر چاہنے کے بعد اس سے نرمی نہیں برت سکا۔سب ڈرامے بازی ہے توجہ حاصل کرنے کے طریقے ہیں۔اس دل میں کہا دوا آجائے تو کھا لینا۔وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''دوا سے کیا ہو گا بادل...... کنویں کی پیاس تو پانی سے بجھتی ہے رسی سے نہیں۔ پیاسی زمین تو بارش سے سیراب ہوتی ہے کھاد سے نہیں''۔وہ کرب سے بولی۔

''اتنی گہری گہری باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ستارہ بیگم، جو مل رہا ہے اسے بھی غنیمت سمجھو......وہ تلخی سے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا اور اس میں تو اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ روکتی اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

''بہت خوب ابھی تک خوابِ غفلت میں ہیں محترمہ...... اے اٹھو''۔بادل خان رات گئے بیڈ روم میں آیا تو اسے سویا دیکھا اس پر سے کمبل کھینچتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا اور ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔اسے دیکھ کر جیسے ہوش میں آگئی تھی۔بدن ٹوٹ رہا تھا مگر اسے اُٹھنا پڑا۔

''کھانا کیا تمہارا باپ پکا کر دے گا جو سونے سے ہی فرصت نہیں ہے''۔وہ دھاڑا۔

''میرا باپ۔مر چکا ہے اب تو بخش دیجئے اسے''۔وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''اچھا اچھا زیادہ بحث نہیں چاہیے کھانا لاؤ جلدی سے''۔وہ جھلا کر بولا تو وہ

ہمت کر کے بستر سے باہر نکل آئی دوپٹہ شانوں پر پھیلایا پاؤں میں چپل پہننے لگی تو بری طرح چکرا گئی بیڈ کی بیک پر اس کا ہاتھ نہ پڑتا تو نیچے جا گرتی۔

"نہ نہ ستارہ بیگم ...... میں ان اداؤں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں یہ اداکاری کسی اور دکھائیے گا۔ جائیے اور میرے لیے کھانا لے کر آئیے چلیئے شاباش"۔ بادل خان نے بہت سنگدلی سے کہا تو ستارہ کو شدید غصہ آیا وہ اس کی تکلیف کو ادائیں اور اداکاری کہہ رہا تھا۔ اس نے طنز سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر سے اُٹھ کھڑی ہوئی غصے نے اس میں اتنی قوت بھر دی تھی کہ وہ اس کے لیے کھانا پکا کر لا سکتی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر سیدھی کچن میں آئی منہ ہاتھ دھو کر فریج کھول کر دیکھا اس نے مٹر قیمہ پکایا تھا۔ دوپہر کے لیے جو اسی طرح رکھا تھا۔ آٹا گوندھا ہوا تھا۔ اس نے سالن گرم ہونے کے لیے چولہے پر رکھ دیا اور دوسرے چولہے پر پھلکے ڈالنے لگی۔ کھانا پکارتے ہوئے اسے خود بھی بھوک لگنے لگی صبح سے رات ہو گئی تھی۔ بھوک سے برا حال تھا۔ بادل خان کو وہ بیڈ روم میں ہی کھانا دے آئی اور کچن میں بیٹھ کر کھانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانے کے برتن لیئے کچن میں موجود تھا۔ "میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے تمہیں"۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے"۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئی بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھ پر احسانِ عظیم کرنے کی"۔ وہ تلخی سے بولا۔

احسان کیسا یہ تو میرا فرض ہے اور ذمہ داری بھی۔ آپ کمرے میں جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اور ہاں سوئیٹر پہن لیجے بہت ٹھنڈ ہے آج"۔ اس نے بہت تحمل سے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بلڈ پریشر تمہارا لو ہوا ہے سوئیٹر کی ضرورت بھی تمہیں ہے مجھے نہیں ...... ہونہہ۔ بڑی آئیں خیال رکھنے والی"۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا اور کرسی پر پاؤں مار کر باہر نکل گیا۔

بادل ...... آپ کو بدلنا ہوگا میری خاطر آپ کو اعتبار کرنا ہوگا مجھ پر میری محبت پر اور نیک نیتی پر سب لڑکیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہر عورت آپ کی ماں جیسی نہیں

ہوتی آپ کو ایک دن ماننا پڑے گا"۔ وہ چائے بناتے ہوئے اسے دل میں مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا، چھٹی تھی ...... بادل خان گھر پر ہی موجود تھا۔ ستارہ کی طبیعت بھی قدرے بہتر تھی وہ صائمہ بھابھی کے ساتھ مارکیٹ سے سودا سلف لانے اور اپنا چیک اپ کرانے کی غرض سے تیار ہو گئی تھی۔ صائمہ بھابھی کی برتھ ڈے تھی دو دن بعد وہ اس کے لیے خریداری کرنا چاہ رہی تھی اور ستارہ نے ان کے لیے گفٹ بھی خریدنے کا سوچ رکھا تھا۔ مگر مسئلہ بادل خان کی اجازت کا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں ٹی۔ وی آن کیے بیٹھا تھا۔

"سنیئے" ...... وہ اس کے قریب جا کر بولی۔ "مجھے مارکیٹ جانا ہے کچن کا سامان خریدنے چلی جاؤں صائمہ بھابھی کے ساتھ"۔

ویسے تمہیں میرے گھر پر نہ ہونے کا شکوہ ہوتا ہے آج جب میں گھر پر موجود ہوں تو تمہیں باہر جانے کی شاپنگ کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ میں گھر بیٹھا اتنا ہی برا لگ رہا ہوں تو صاف کہو۔ تم کیوں جاتی ہو۔ میں ہی دفعہ ہو جاتا ہوں"۔ وہ غصیلے لہجے میں گرجا تو اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے دل میں کہا۔

"اُف خدایا ...... آخر بادل ہر بات کو غلط انداز سے کیوں سوچتے اور دیکھتے ہیں؟"۔

"کہاں جا رہی ہو؟"۔ وہ جانے کے لیے مڑی تو اس نے اس کی کلائی پکڑ کر اتنی زور سے اپنی طرف کھینچی کہ وہ اس کے پہلو میں آ گری۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرا گیا تھا۔ بادل ...... پلیز آپ، جو چاہیں سلوک کریں میرے ساتھ مگر ...... مجھے اس طرح ٹارچر مت کریں۔ مجھ میں کوئی نقصان اٹھانے اور سہنے کی سکت نہیں ہے"۔

وہ اپنی حالت کو بہت حد تک سمجھ گئی تھی اس لیے فکرمندی سے بھیگی آواز میں بولی۔

"اب تک کتنے نقصان اٹھا چکی ہو تو میری وجہ سے ذرا گنواؤ تو"۔

وہ اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے اس کی جھیل کنول آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تکلیف سے دکھ کے۔

''بعض نقصان بتائے نہیں جا سکتے نہ دکھائے اور گنوائے جا سکتے ہیں۔ صرف محسوس کیے جا سکتے ہیں''۔

وہ سنجیدہ، پرنم اور گہرے معنی خیز لہجے میں بولی۔

''اور میں ٹھہرا بے حس آدمی ہے نا......''

''نہیں آپ تو بہت اچھے ہیں''۔

''اوشٹ اپ ...... حد ہوتی ہے منافقت کی''۔ اس نے غصے سے اس کا چہرہ اور بازو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ میز سے جا ٹکرائی تکلیف سے اس کے لبوں سے ہلکی سے چیخ نکل گئی۔

''میں منافق نہیں ہوں بادل''۔ اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

''تم مخلص بھی نہیں ہو''۔ وہ تلخی سے سفاکی سے بولا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ میز پر ہاتھ مضبوط کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی خراب حالت پر تشویش ہو رہی تھی۔

''اگر میرا شک درست نکلا اور وہی ہوا جو میں سمجھ رہی ہوں تو ...... بادل کا یہ رویہ سب کچھ ختم کر دے گا''۔ وہ سر تھامے دکھ سے سوچ رہی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں اب جاؤ، صائمہ بھابھی باہر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے تمہارے ساتھ جائے گا اپنی گاڑی میں''۔

بادل خان کی سپاٹ آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اس میں اب جانے کی ہمت نہیں تھی مگر چیک اپ کرانا ضروری تھا وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔ سو کھڑی ہو گئی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ آپ ...... خفا تو نہیں ہوں گے''۔

''جاؤ دیر ہو رہی ہے۔ یہ پیسے رکھ لو کام آئیں گے''۔ وہ چند سیکنڈ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اپنا والٹ اٹھا لایا اور اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا ستارہ نے فی الوقت اسی کو بہت جانا اور باہر گاڑی میں آ بیٹھی۔

تمہاری طبیعت تو پہلے سے بھی خراب لگ رہی ہے۔ کیوں نہ پہلے تمہارا چیک

اپ اور ٹیسٹ وغیرہ کروالیں۔ صائمہ بھابھی نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے''۔ وہ آہستہ سے بولی تو صائمہ بھابھی نے ڈرائیور سے کہا او کے ڈرائیور چاچا ...... پہلے آپ ہاسپٹل چلیں۔ شاپنگ ہم بعد میں کریں گے''۔

جو حکم بی بی ...... بیگم صاحبہ، کو کل دوائی سے فرق نہیں پڑا کیا؟'' ڈرائیور چاچا نے پوچھا۔ نہیں چاچا، اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ بادل بھائی سے میں نے کہا بھی تھا کہ اس کا چیک اپ اور ٹیسٹ کرا لیں مگر وہ تو سدا کے لاپرواہ ہیں۔ صائمہ بھابھی بولیں۔

''اس میں ان کا بھی قصور نہیں ہے بی بی، انہیں پرواہ کرنا کسی نے سکھایا ہی نہیں نہ ان کی کسی نے پرواہ کی۔ جیسا ماحول انہیں ملا وہ ویسے ہی بن گئے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ستارہ بیٹی، انہیں پرواہ کرنا سکھا دیں گی۔ ڈرائیور چاچا نے سنجیدگی سے کہا۔

انشاء اللہ...... صائمہ بھابھی نے دل سے کہا تو ستارہ مسکرا دی۔

ستارہ کے چیک اپ اور ٹیسٹ رپورٹس لے کر صائمہ بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے فکر مندی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھا۔ ہیلو سوئیٹ گرل، کہاں گم ہو؟''۔

''کہیں نہیں ...... رپورٹس آ گئیں''۔ وہ چونک کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں''۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔ بوجھو تو اس رپورٹ میں کیا خوشخبری ہے تمہارے لیے؟

''بتایا تو تھا میں نے''۔ وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''ہم دونوں کا شک درست نکلا۔ بہت بہت مبارک ہو تم امید سے ہو''۔

''واقعی'' ...... وہ شرما گئی اور ہنستے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
صائمہ بھابھی بھی ہنس دیں۔ ''اُف کیا قاتل ادا ہے، اگر بادل بھائی دیکھ لیتے تو
یہیں تم پر نثار ہو جاتے۔ چلو انہیں یہ خوشخبری مٹھائی کے ساتھ سناتے ہیں۔ صائمہ
بھابھی نے اس کے ماتھے کو چوم کر کہا۔

نہیں بھابھی ...... اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ انہیں اس بارے
میں ابھی کچھ نہیں بتانا، بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔

''مگر کیوں ستارہ؟'' صائمہ بھابھی نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بھابھی ...... میں نہیں چاہتی کہ بادل کو ان کے بچے کی کشش میرے پاس کھینچ کر
لائے۔ میں اپنی محبت آزمانا چاہتی ہوں۔ ابھی اپنا آپ آزمانا چاہتی ہوں ہار گئی تو
......

''ارے نہیں'' ...... وہ فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے پیار سے بولیں۔ ''تم
نہیں ہار سکتیں بلکہ بادل بھائی ہار جائیں گے۔ اور تم میں جو کشش ہے وہ کسی اور میں
کہاں؟''۔

''تو پھر وہ ان کی اتنی ساری گرل فرینڈز''۔

''وہ وقتی سہارے ہیں، وہ ان سب کو دیکھ پرکھ چکے ہیں۔ دل ہی دل میں ان
کا مذاق بھی اڑاتے ہوں گے۔ ان کی بیوی تو ایک ہی ہے اور وہ تم ہو۔ اگر ان میں
سے کسی کو وہ اس مقام کے لائق سمجھتے تو تم سے تھوڑی شادی کرتے۔ وہ رشتوں کے
ڈسے ہوئے ہیں اس لیے جلد کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ انہیں وہ تمام لڑکیاں
بھی بے وفا اور شرم وحیا سے عاری لگتی ہے۔ لیکن تم ان سب سے مختلف ہو۔ اور تم نے
تو بتایا تھا کہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے تھے تم ان کے دل کو اچھی لگی تھیں''۔

انہوں نے تو یہی کہا تھا اور شادی کے شروع کے ایک مہینے تک میرا جس طرح
خیال رکھا تھا۔ جتنا پیار مجھے دیا تھا۔ اس سے میں نے ان کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا
اور یقین تو مجھے اب بھی ہے۔ بس کبھی کبھی ان کے رویے کی تلخی دل دکھا دیتی ہے''۔
وہ سنجیدگی سے بولی۔

''اللہ بہتر کرے گا ...... بس تم ثابت قدم رہنا۔ بادل بھائی، کی گرل فرینڈز جو
پھر سے آنے لگی ہیں اس وجہ سے وہ تمہیں بھی ان سے کمپیئر کرنے لگے ہیں۔ تم تو ہو
سب سے الگ اور سب سے جدا۔ ستارہ ہماری واہ بھئی واہ''۔
صائمہ بھابھی نے ٹی۔وی کمرشل کے انداز میں آخری جملہ ادا کیا تو اسے ہنسی آ
گئی۔

اسی طرح ہنستی مسکراتی اور خوش رہا کرو، بادل بھائی، کی فکر چھوڑو اپنی فکر کرو،
مینشن کی بجائے پراپر ڈائیٹ (مناسب غذا) لینا شروع کرو۔ اب چلیں شاپنگ بھی
کرنی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ تو اس نے کہا۔

''میں پہلے جوس پیئوں گی''۔

''ضرور میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ آؤ شاباش''۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کا
ہاتھ تھامے ہاسپٹل سے باہر آ گئیں۔ پہلے انہوں نے جوس پیا پھر کچن کا سامان
خریدا۔ ضروری شاپنگ کی اور گھر میں آ گئیں۔ بادل خان نے اس کے آتے ہی
ڈرائیور چاچا کو بلا کر پوچھا۔ ''کہاں کہاں گئی تھیں بی بی، اتنی دیر کیوں لگی؟''

صاحب ...... آج اتوار بازار لگا ہے نا تو وہاں رش بہت زیادہ تھا اس لیے دیر
ہو گئی ...... پھر وہ صائمہ بی بی نے زیادہ شاپنگ کرنی تھی اس لیے بھی دیر ہو گئی''۔

ڈرائیور چاچا نے دانستہ ان کے ہسپتال جانے والی بات گول کر دی کیونکہ
اسے معلوم تھا کہ بادل خان جب خود ستارہ کو ہسپتال نہیں لے گیا تو اس کے صائمہ
بھابھی کے ساتھ جانے پر غصے ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے گھر کا پرانا ملازم تھا اس کے
بچپن سے وہ اسی کے ہاں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے مزاج کو سمجھ گیا تھا اب تو۔

''ٹھیک ہے جاؤ تم''۔ بادل خان نے سپاٹ لہجے میں کہا وہ چلا گیا ستارہ جو
کچن کی جانب جا رہی تھی اس کی بات سننے کے لیے رک گئی تھی۔ اب خود بھی تیزی
سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اسے ڈرائیور چاچا کی معاملہ فہمی پر حیرت بھی ہوئی اور
اطمینان بھی۔

بادل ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اکیلی بور ہو رہی تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ چکی

تھی۔ وہ کچھ دنوں سے آگے ایڈمشن لینے کا سوچ رہی تھی۔ بی۔ ایڈ کرنے کا ارادہ تھا
اس کے ایڈمشن بھی شروع ہو گئے تھے۔ مگر بادل خان سے بات کرنے کا موقع ہی
نہیں مل رہا تھا۔ نجانے وہ رات کے بارہ ایک بجے تک کہاں رہتا تھا۔ گھر میں آج
کل اس کی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کا آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

''بادل یقیناً اب خود ان لوگوں سے باہر کہیں ملتے ہوں گے جبھی تو اتنی دیر سے
گھر آتے ہیں''۔ ستارہ نے دل میں سوچا۔

بادل خان رات کے ساڑھے بارہ بجے گھر آیا وہ کافی تھکا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔
آتے ہی بستر پر گر گیا۔ نہ چینج کیا نہ جوتے اُتارے نہ ستارہ سے کچھ کہا حتیٰ کہ اس کے سلام
تک کا جواب نہیں دیا۔ تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اس نے اس کے جوتے اُتارنے چاہے تو اس
نے پاؤں پیچھے کر لیے اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں خود اُتار سکتا ہوں''۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟'' ......

''ہاں ہے پھر''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو اس نے اپنائیت سے کہا۔ ''مجھے
نہیں بتائیں گے''۔

''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''میں بیوی ہوں آپ کی''۔
اس نے کہا۔

''اچھا تو پھر بیوی کو ہر بات بتانا ضروری ہوتی ہے''۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولتا
اُٹھ بیٹھا۔

''میرے خیال میں تو بتانا چاہیے کیونکہ بیوی دکھ درد کی ساتھی ہوتی ہے اس
سے تو شوہر اپنی ہر بات ہر پریشانی شیئر کر سکتا ہے''۔ اس نے اپنا لہجہ نرم اور اپنائیت
بھرا رکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں تم سے کچھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا۔ سنا تم نے''۔ اس نے بدتمیزی
سے کہا۔

''مرضی ہے آپ کی میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتی''۔

''اور کتنا مجبور کرو گی تم مجھے؟''۔ وہ بڑی تیزی سے بولتا اس پر ایک نگاہِ قاتل

ڈال کر واش روم میں چلا گیا۔ ستارہ اس کے لیے کھانا گرم کر کے لائی تو وہ کپڑے
تبدیل کر کے باہر آ چکا تھا۔ شاید بھوک ہی لگ رہی تھی اسے اس لیے اس کے کہنے
اور بلانے سے پہلے ہی کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے
کھانے لگی کھانا تو وہ کھا چکی تھی۔ اسے بھوک بھی اب وقت بے وقت لگنے لگی تھی۔ مگر
بادل خان کا ساتھ بھی دینا ضروری تھا۔

''کل صائمہ بھابھی کی برتھ ڈے ہے انہوں نے مجھے بھی انوائیٹ کیا ہے''۔
ستارہ نے بات شروع کی تو وہ بولا ''مجھ سے تو انہوں نے ذکر نہیں کیا انور نے بھی
نہیں بتایا''۔

''انہوں نے صرف اپنی فرینڈز کو بلایا ہے''۔

''تم ان کی فرینڈز میں کب سے شمار ہونے لگیں''۔ اس نے طنزیہ لہجے میں
پوچھا۔

''میں ان کی برتھ ڈے کے فنکشن میں چلی جاؤں بادل''۔ اس نے اس کے
طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بہت اُمید بھرے لہجے میں پوچھا تو اس نے اس کے
چہرے کو چند سکینڈ غور سے دیکھا پھر پلیٹ پر نظریں جھکا کر بولا۔ ''چلی جانا'' .....

''تھینک یو بادل، آپ بہت اچھے ہیں''۔ اس نے خوشی سے مسکراتے ہوئے
کہا تو وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

صائمہ بھابھی کی سالگرہ کے فنکشن میں جانے کے لیے وہ تیار ہو چکی تھی۔ اس
نے ڈارک براؤن کلر کا ویلوٹ کا بہت ہی خوبصورت لباس پہنا تھا۔ قمیض پر
خوبصورت کٹ ورک اور سفید نگوں کا دیدہ زیب کام کیا ہوا تھا۔ اس نے ڈائمنڈ کا
وہی سیٹ پہنا جو اسے بادل خان نے شادی کی رات گفٹ کیا تھا۔ نیکلس اور ٹاپس،
بال کھول کر اسٹائلش لک دینے کے بعد تو وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ صائمہ بھابھی
کا فون بھی آ چکا تھا اور ان کے بچے بھی ایک چکر لگا گئے تھے۔ اسے بلانے آئے تھے
وہ۔ سات بجنے والے تھے۔ وہ گفٹ پیک اٹھا کر جانے لگی تو اسی وقت بادل خان
کمرے میں داخل ہوا اس کی سج دھج دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ وہ اس کے مسلسل اس

طرح دیکھنے پر نروس ہو رہی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''۔ بادل خان نے اپنی بے خودی کو جھٹکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''صائمہ بھابھی کے گھر ان کی برتھ ڈے ہے نا آج''۔

''ٹھیک ہے جاؤ مگر جلدی آنا''۔ وہ یہ کہتا ہوا بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔

''بادل، کیا ہوا آپ کو؟''۔ وہ گھبرا گئی گفٹ ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آ کر پوچھا۔

''تم سے مطلب تم جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے تمہارے بغیر وہاں سالگرہ کا کیک نہیں کٹے گا''۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

بادل پلیز، کچھ بتایئے تو کیا ہوا ہے؟ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے مجھے مزید چیخنے پر مجبور مت کرو اور تمہیں اس سے کیا کہ مجھے کیا ہوا تم جاؤ جا کر سالگرہ کا فنکشن اٹینڈ کرو''۔

وہ سیدھا ہو کر لیٹتے ہوئے تلخی اور طنز سے بولا تو وہ کمرے سے باہر آ گئی اور ڈرائنگ روم میں رکھے فون سیٹ سے اس نے صائمہ بھابھی کو فون کر کے گھر میں اچانک مہمانوں کے آنے کا بہانہ بنایا اور نہ آنے پر معذرت کر لی جو انہوں نے بمشکل قبول کی۔

''ہونہہ...... میری ہمدرد، مجھ سے محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی بیوی۔ سب دعوے ہیں۔ جھوٹے اور بودے دعوے۔ اسے میری نہیں سالگرہ اٹینڈ کرنے کی فکر ہے۔ مائی فٹ''۔ بادل خان نے غصے سے بآواز کہا جو دروازے تک پہنچتی ستارہ نے سن لیا اور مسکرا دی۔ بادل خان نے غصے میں اپنا جوتا اتار کر دروازے پر دے مارا۔ ستارہ ذرا بعد اندر داخل ہوئی تو اسی وقت بادل خان نے دوسرا جوتا پاؤں سے براہ راست فضا میں اچھالا تھا۔ وہ بچ کر ایک طرف ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو ٹرے تھی جس میں سینڈوچ چائے، پانی سے بھرا گلاس اور سر درد کی گولیاں رکھی تھیں۔

ارے ارے بادل، کیا ہو گیا کیوں اتنا غصہ آ رہا ہے آپ کو؟۔ وہ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پیار سے بولی تو وہ ابھی تک گھر میں موجود دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔

''تم ابھی یہیں ہو''۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے تو ہمیشہ یہیں رہنا ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف آئی۔

''گئیں کیوں نہیں؟''۔ وہ اس کے حسن کے جلوؤں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے کہیں نہیں جانا''۔ وہ اس کی ٹائی کھولتے ہوئے بولی۔

''صائمہ بھابھی ناراض ہوں گی''۔ وہ اس کے رویئے پر حیران تھا کیسی لڑکی تھی وہ اس کی خاطر ہر خوشی ہر فنکشن ترک کیے جا رہی تھی اور خوش تھی۔

''میں انہیں منا لوں گی''۔ وہ بہت مگن انداز میں اس کی کلائی سے گھڑی اتارتے ہوئے بولی۔ ''اور اگر وہ نہ مانیں تو''۔ نجانے کیوں وہ اس کے دل کی بات جاننا چاہ رہا تھا۔ وہ بھی اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی پر آئے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولی۔
تو نہ سہی، میرے لیے تو آپ سب سے اہم ہیں میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتی''۔

''کیوں؟''۔ وہ اس کے حسن و محبت اور اپنائیت بھرے لمس کے احساس میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ آپ بہت اچھے ہیں''۔ اس نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو بادل خان کا دل چاہا کہ اسے اپنی محبتوں میں پور پور بھگو دے مگر اپنے جذبات پر جبر کرتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ انتہائی ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بادل، یہ لیجئے پہلے سینڈوچ کھا لیں پھر ٹیبلٹ کھا کر چائے پی لیجئے گا''۔

وہ ٹرے اٹھا کر لے آئی۔ تو وہ رخ پھیر کر بولا۔ ''مجھے کچھ نہیں کھانا''۔

''ضد نہیں کرتے بادل، آپ تو بہت اچھے بچے ہیں ناں لیں شاباش تھوڑا سا کھا لیں''۔ وہ بہت محبت بھرے انداز میں اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولی تو وہ انکار نہ کر سکا۔ ستارہ نے اپنے ہاتھ سے اسے سینڈوچ کھلایا۔ پھر گولیاں کھلائیں

اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں دے کر اس کے کپڑے واش روم میں ہک پر لٹکا
آئی۔

"کیا یہ سچ مچ ایسی ہی ہے جیسی نظر آتی ہے جیسا رویہ اور عمل رکھتی ہے؟"۔
بادل خان نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا اور چائے ختم کر کے
وہ واش روم میں چلا گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

"لائٹ آف کر دوں"۔ ستارہ نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اس
کے اسی سجے سنورے روپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ محسوس کرنا چاہتا تھا۔

آپ سونے کی کوشش کریں انشاء اللہ سر درد ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اس کے
قریب بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کا سر دباتے ہوئے بولی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔
ستارہ کی قربت کی مہک اس کے اندر ہلچل مچا رہی تھی اور وہ ان لمحات کو اپنے خود
ساختہ مفروضوں کی نذر کرتے ہوئے خود بھی جھنجھلا رہا تھا۔ ستارہ کی نرم ملائم انگلیوں
کی جنبش اس کے ہاتھ کا ہلکا ہلکا دباؤ اسے بہت سکون اور سرور بخش رہا تھا۔ وہ بے خود
اور بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بے اختیار اپنا سر ستارہ کی گود میں
رکھ دیا۔

ستارہ کا پورا وجود جھنجھنا اُٹھا۔ ایک آگ ایک سنسناہٹ اس کے پورے بدن
میں رینگ گئی۔ اس کے ہاتھ خود بخود رک گئے۔ اور پھر اس نے جلدی سے خود پر قابو
پایا اور سنبھل کر پھر سے بادل خان کا سر دبانے لگی۔ اس کے لبوں پر بہت اطمینان
بخش مسکراہٹ سج گئی۔ بادل خان تھوڑی دیر بعد سو گیا تو اس نے بہت احتیاط سے
اس کا سر تکیے پر رکھ دیا اور کمبل اس پر اچھی طرح پھیلا دیا۔ اس کے چہرے کو وہ دیر
تک محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اٹھ گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے عشاء کی
نماز کے لیے وضو کیا۔ رات کو اچانک اس کی آنکھ کھلی تو بادل خان کو بستر سے غائب
پایا۔ اس نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا واش روم میں جھانکا وہ کہیں نہیں تھا۔

بادل.... کہاں چلے گئے، یا اللہ خیر..... اس نے اپنے پریشان دل پر ہاتھ رکھا
اور گرم شال اُٹھا کر اپنے شانوں کے اردگرد پھیلا کر باہر نکل آئی ڈرائنگ روم بھی

خالی تھا۔ اس نے گلاس ونڈو سے باہر جھانکا تو اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ بادل
شدید سردی میں لان میں بیٹھا تھا۔

وہ شال اچھی طرح اوڑھ کر باہر نکلی تو سردی کی وجہ سے کانپ گئی۔ بادل خان
سنگی بنچ پر اس کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ ستارہ نے آہستہ سے
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے پکارا۔ بادل ..... بادل خان نے آنکھیں کھول
کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں تیز خشک ہوا سے اس کے ریشمی بال لہرا رہے تھے۔
چاندنی رات کی چاندنی میں اس کا چہرہ دل کو موہ لینے کی حد تک حسین لگ رہا تھا۔
بادل خان بس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ "آپ یہاں کیوں آ گئے بادل، میں تو پریشان
ہو گئی تھی کہ نجانے آپ کہاں چلے گئے۔ یہاں تو بہت سردی ہے آپ کے تو سر میں
درد تھا اور

"اب نہیں ہے"۔ وہ اس کی بات کاٹ کر مدھم لہجے میں بولا نظریں اب تک
اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے
بولی۔

"پھر بھی یہاں بہت ٹھنڈ ہے اندر چلیئے نا"۔

"تم جاؤ مجھے نہیں لگ رہی ٹھنڈ"۔ وہ آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اندر آگ لگی ہو تو ٹھنڈ نہیں لگتی"۔ وہ اپنے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتے
ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی تو بادل خان نے نظریں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے
اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔ شاید وہ بھی اندر سے جل رہی تھی۔
اس کے اندر بھی اس کی بے رخی اور بے حسی نے آگ لگا رکھی تھی۔ بادل خان نے
گہرا سانس فضا میں خارج کیا۔

بادل...... اپنی پریشان مجھ سے شیئر کیوں نہیں کرتے آپ؟۔ اس نے دکھی لہجے
میں پوچھا۔

"تم کیا کر لوں گی میری پریشانی جان کر؟"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

کچھ نہ بھی کر سکی تو کم از کم آپ کی ہمت تو بندھا سکتی ہوں آپ کو حوصلہ تو دے

سکتی ہوں۔ پلیز بادل، بے شک مجھے کسی قابل مت سمجھئے مگر اپنی پریشانی تو مجھ سے شیئر کیجیے آپ کل رات سے پریشان ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ بتائیے نا پلیز کیا بات ہے؟۔ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بہت نرمی اور محبت سے کہا۔

''بزنس اور پیسے کا معاملہ ہے تم کیا کرو گی جان کر؟''۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔

''پھر بھی بتائیے تو''۔ اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں اسرار کیا۔

مجھے باہر کی ایک کمپنی کا بہت بڑا آرڈر ملا ہے۔ جسے عید سے پہلے مکمل کرنا ہے۔ ڈیل ہو چکی ہے پیسہ لیا جا چکا ہے اور۔ مال سپلائی نہیں ہو رہا تو تیار کیسے اور کب ہو گا؟ میرا کیشیئر تمام رقم لے کر غائب ہو گیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی وہ پہلے ہی مختلف بلز اور گڈز پر خرچ کی جا چکی ہے صرف تین لاکھ روپے ہیں میرے پاس۔ اور تین لاکھ روپے سے اتنا بڑا آرڈر پورا کرنا ناممکن ہے اور جو مال پہلے سے بک تھا وہ بھی آج پہنچ گیا ہے۔ مگر پے منٹ کے لیے رقم نہیں ہے۔ اگر کل تک رقم ادا نہ کی گئی تو...... میری کمپنی کی ریپوٹیشن (ساکھ) پر برا اثر پڑے گا۔ آج تو میں نے بہانہ بنا دیا کہ کیشیئر چھٹی پر ہے۔ میں چاہوں تو مجھے وہ لوگ تین چار ماہ تک بلکہ اگلے مال کی سپلائی تک پے منٹ کے لیے نہیں کہیں گے میرا برسوں کا لین دین ہے ان سے اور اعتبار پر تو ان پر قائم ہے لیکن...... میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ خود کو کمزور اور مجبور ظاہر نہیں کرنا چاہتا''۔ بادل خان نے سنجیدہ لہجے میں بہت تفصیل سے اسے ساری بات بتا دی۔

''انشاء اللہ ایسا ہو گا بھی نہیں''۔ ستارہ نے یقین سے کہا۔ ''یہ بتائیے کہ کتنی رقم چاہیے کل تک؟''۔

''پانچ لاکھ تو فوری چاہئیں تاکہ صبح پے منٹ ہو سکے اس کے علاوہ آرڈر کے مال کے لیے بھی اتنی ہی رقم چاہیے باقی تین لاکھ ہیں میرے پاس۔ سارا پیسہ ایک ساتھ نکل گیا۔ میرے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا اور وہ کیشیئر خبیث برسوں سے وہ میرے

پاس کام کر رہا ہے۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں مجھے بزنس میں آئے مگر...... ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج تک میں نے اپنے کسی ملازم یا کاریگر کی تنخواہ نہیں روکی اور اس خبیث نے مجھے ایک دم پندرہ لاکھ روپے کا دھچکا پہنچایا ہے۔ میں چھوڑوں گا تو نہیں اسے۔

وہ غصے اور دکھ سے چور لہجے میں بولا۔

''اچھا چلیں غصہ مت کریں''۔ ستارہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔

''میرا اتنا بڑا نقصان ہو گیا اور تم کہہ رہی ہو کہ غصہ نہ کریں''۔ وہ خفگی سے بولا۔ بادل...... بزنس میں تو نفع نقصان ہوتا رہتا ہے۔ اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں آپ تو خود بزنس مین ہوں۔ جانتے ہوں گے سب یوں حوصلہ ہارنے سے تو کام نہیں چلے گا۔

وہ پیار سے اسے سمجھانے لگی تو اس نے پوچھا۔ ''تو پھر کیسے چلے گا؟''۔

''بڑے نقصان کو بڑے حوصلے سے ہی فیس کرنا چاہیے''۔

''صرف حوصلے سے تو رقم کا بندوبست نہیں ہو جائے گا''۔ وہ چڑ کر بولا۔ میری جان...... میرے پیارے بادل...... یوں سمجھیں کہ رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔

اس نے بہت محبت سے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے مسکراتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟''۔ اس نے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''پہلے آپ اندر چلیں''۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔ ''چلیے نا ابھی آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی''۔ اس نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مقید کرتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیوں کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟''۔

''یہ خزانہ ہی تو ہے میرے ہاتھ میں''۔ اس نے اس کے ہاتھ کو ملائمیت سہلاتے ہوئے معنی خیز بات کہی۔ بادل خان اس کے محبت بھرے انداز، لمس

جملوں کے سحر میں جکڑ سا گیا بہت مشکل سے اسے دل کو قابو کرنا پڑا۔ وہ محبت کروانے کے سارے گر جانتی تھی کیسے اسے اس کی تمام تر بدتمیزیوں، بے رخی، بے حسی اور بے مروتی کے باوجود اپنے پیار سے آسودہ اور پرسکون کر رہی تھی۔ اس کے جسم و جان کو روح کو دل کو تسکین اور سرور بخش رہی تھی۔

''بیٹھیں ادھر اور یہ اوڑھ لیں''۔ اس نے کمرے میں آ کر اسے بیڈ پر بٹھایا اور کمبل اس پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میں ہیٹر جلا دوں پہلے''۔

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے''۔ بادل خان نے معنی خیز لہجے میں کہا وہ اس کے نرم گرم لمس کی حدت اور حرارت میں مہک رہا تھا۔ سردی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا اسے۔

''تو جناب ...... جس چیز کی ضرورت ہے وہ میں آپ کو دیتی ہوں''۔ وہ اس کے جملے پر اندر سے مسکرا دی تھی۔ بظاہر انجان بن کر پہلے سے انداز میں ہی مسکراتے ہوئے بولی اور اپنی وارڈ روب کی دراز میں سے اپنا پرس نکال کر اس میں سے چیک بک نکالی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔ اور پرس واپس رکھ کر اپنے زیورات کا بڑا سا لفافہ بھی اٹھا لائی اور اس کے سامنے بیڈ پر رکھ دیا۔ اور خود بھی بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لیجئے پانچ لاکھ روپے کا چیک ہے یہ آپ اسے صبح کیش کرا لیجئے گا اور پے منٹ کر دیجئے گا''۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس یہ رقم کہاں سے آئی؟''۔ اس نے چیک لے کر دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''ارے''۔ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''آپ بھول گئے بادل، آپ ہی نے تو یہ رقم مجھے شادی کی رات گفٹ کی تھی۔ میرا اکاؤنٹ کھلوایا تھا مجھے تو ضرورت ہی نہیں پڑی اس لیے یہ رقم جوں کی توں بینک اکاؤنٹ میں موجود ہے۔ آپ صبح نکلوا لیجئے گا''۔

''نہیں یہ تمہاری رقم ہے اور گفٹ شدہ رقم ہے''۔ اس نے چیک واپس کرتے

ہوئے کہا۔

''یہ کیا کہا آپ نے، جناب، اپنوں میں میری تمہاری کوئی نہیں ہوتی بلکہ ہماری ہوتی ہے۔ اور میاں بیوی کا ایک دوسرے کی چیزوں پر پیسوں پر حق ہوتا ہے۔ آپ کا مجھ پر حق ہے اور میرا آپ پر۔ اور میرے پاس اپنا کیا ہے مجھے بھی تو آپ ہی نے دیا ہے۔ یہ رقم آپ ہی کی کمائی ہوئی ہے اب اگر آپ کے کام آ جائے گی تو اس سے اچھا مصرف اس کا اور کیا ہو سکتا ہے؟''۔ ستارہ نے اسے چاہت سے دیکھتے ہوئے محبت سے مہکتے لہجے میں کہا۔

''یہ کس قسم کی لڑکی ہے؟''۔ بادل نے حیرت اور مسرت سے دل میں کہا۔

''تم یہ سب دل سے کہہ رہی ہو''۔ یہ یقین کرنے کے باوجود پوچھنے سے باز نہ رہ سکا۔

بادل ...... ستارہ کو اس کی اس بات نے بہت دکھ دیا اس نے ایک لمحے کو بہت دکھ سے اسے دیکھا وہ شرمندگی سے نظریں چرا گیا۔ وہ سنجیدہ اور مدھم دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

آپ کو میرے خلوص اور نیک نیتی پر شک ہے مگر پھر بھی آپ یہ رقم لے لیجئے کیونکہ یہ رقم تو آپ ہی کی ہے...... مجھے رقم کی ضرورت نہیں ہے بادل ...... یہ آپ رکھ لیجئے''۔

''تھینک یو''۔ اس نے چیک لیتے ہوئے کہا وہ اندر سے اس سے شرمندہ تھا اپنے کہنے پر۔

پھر وہی بات اپنوں میں یہ تکلفات ضروری نہیں ہوتے اور اپنی چیز کے سلسلے میں تو بالکل بھی نہیں ہوتے۔ اس میں میرا کیا کمال ہے بھلا آپ کی چیز تھی جو میں نے آپ کو لوٹائی ہے اور ہاں ...... یہ میرے زیورات ہیں آپ انہیں بیچ کر آرڈر پورا کر لیجئے''۔

''اب میں تمہارے زیورات بیچوں گا تم نے مجھے اتنا گیا گزرا، گرا پڑا اور بے غیرت سمجھ رکھا ہے''۔ وہ ایک دم سے جلال میں آتے ہوئے گرجنے لگا۔

''نہیں بادل ...... اللہ نہ کرے کہ ایسا کوئی وقت آئے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ کاش، میں آپ کو سمجھا سکتی کہ میں آپ کو کیا سمجھتی ہوں ...... لیکن یقین کریں وہ نہیں سمجھتی جو آپ نے سمجھا اور کہا ہے''۔ وہ تڑپ کر بولی۔

''اپنی پاؤ یہ زیورات یہاں سے اٹھاؤ''۔ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔

بادل ...... زیورات تو دوبارہ بھی بنائے جا سکتے ہیں لیکن ساکھ دوبارہ بنانا مشکل ہوتا ہے۔ آپ یہ بیچ دیجئے اور رقم سے آرڈر پورا کرلیں۔ زیور ہوتے کس لیے ہیں۔ مشکل وقت میں ضرورت پڑنے پر کام نہ آسکیں تو کیا فائدہ ان کا۔ جب آرڈر پورا ہو جائے، رقم مل جائے تو اور بنوا دیجئے گا اگر آپ کا دل چاہے تو''۔ وہ نرمی سے بولی۔

''تم قائل کرنا جانتی ہو، لیکن میں تمہارے زیور نہیں بیچ سکتا۔ یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہیں''۔

''میری شادی کا اصل تحفہ تو آپ ہیں اور میری ہر خوشی میرا اطمینان آپ ہی سے وابستہ ہے آپ خوش اور مطمئن ہوں تو یہ احساس بھی میرے لیے کسی تحفے سے کم نہیں ہے پلیز رکھ لیجئے یہ زیور'' ...... ستارہ نے بہت محبت سے اسے دیکھتے ہوئے شیریں لہجے میں کہا۔

''فی الحال تم انہیں واپس رکھ دو۔ کل تک دیکھتے ہیں کوئی اور انتظام ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ وہ خبیث شخص مل جائے تو پائی پائی ...... وصول کرالوں گا میں اس سے ...... میرے اعتماد کا یہ صلہ دیا ہے اس نے مجھے۔ مل جائے سہی میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا''۔

نہیں بادل ...... آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی مجبوری ہو۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''تو وہ مجھے بتا نہیں سکتا تھا میں کیا انکار کر دیتا میں نے ہمیشہ اپنے ورکرز کا اسٹاف کا خیال رکھا ہے میں ایسے ہی تو اتنا کامیاب بزنس رن نہیں کر رہا''۔

وہ سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں بولا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

آپ اپنے ورکرز کا خیال رکھتے ہیں تو مطمئن رہیے اللہ کو آپ کا یہ فعل ضرور پسند آئے گا اور انشاء اللہ آپ کی ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔

آدھی پریشانی تو ابھی دور ہو گئی ہے۔

شکر ہے اللہ کا، اب سو جائیں، فکرمند نہ ہوں باقی کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔

ستارہ نے زیورات کا ڈبوں والا شاپر اٹھاتے ہوئے ملائمیت سے کہا تو وہ مطمئن ہو کر لیٹ گیا۔ ستارہ بھی شاپر وارڈروب کی دراز میں رکھ کر لاک لگا کر بستر پر آ گئی۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ صبح وہ کام کاج سے جلدی فارغ ہو گئی تھی۔ دو بندوں کا کام ہی کتنا ہوتا تھا۔ تھوڑے سے برتن ایک ایک جوڑا میلے کپڑوں کا۔ وہ دھو دھلا کر ڈسٹنگ کر لیتی۔ لان میں گوڈی اور پانی لگانے کے بعد سارا دن وہ فارغ رہتی۔ اسے بہت بوریت اور کوفت ہوتی تھی۔ اب بھی وہ اخبار دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بادل سے آج موقع ملتے ہیں آگے پڑھنے کے سلسلے میں بات کرے گی۔ ایم۔ اے نہ سہی بی۔ ایڈ تو وہ ضرور کرے گی سمپل بی اے کو تو سکول جاب بھی نہیں مل رہی تھی۔ اور پڑھنے کا شوق تو اسے ویسے بھی بہت تھا میٹرک سے بی۔ اے تک فرسٹ ڈویژن لیتی آئی تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی ضرور تھی مگر ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب بادل خان کے معاملے میں بہت سمجھداری سے تحمل مزاجی اور صبر و برداشت سے کام لے رہی تھی۔ اسے اپنے رب سے قوی امید تھی کہ وہ اس کی محنت اور محبت کا ثمر اسے ضرور عطا کرے گا۔ بادل خان پہلے وہ جیسا محبت کرنے اور خیال رکھنے والا شوہر بن کر اس کی جانب لوٹ آئے گا۔

بادل، بزنس پرابلمز حل ہو گئیں کیا؟''۔ اس نے شام کی چائے اسے پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں ہو گئیں کام انشاء اللہ کل سے شروع ہو جائے گا''۔ وہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا تو اس نے بے اختیار کہا۔ ''شکر الحمد للہ''۔

بادل ...... ایک بات کہنی تھی آپ سے''۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہو''۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے نظریں ٹی وی پر جمائے بولا۔

میں بی۔ایڈ کرنا چاہتی ہوں پڑھنا چاہتی ہوں آگے۔

''کیوں تمہیں کونسا نوکری کرنی ہے؟''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیں۔

''وقت اور حالات کی کسے خبر ہے کیا پتہ نوکری ہی پڑ جائے۔ اس نے سنجیدگی سے کہا او......اب سمجھا''۔ وہ چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے تلخی سے بولا۔ ''تو تم مجھے پانچ لاکھ روپے دے کر پچھتا رہی ہو''۔

''بھلا میں کیوں پچھتاؤں گی، میں تو خوش ہوں کہ وہ رقم آپ کے کام آ گئی''۔ اس نے اس کے اس خیال پر دکھی ہو کر کہا وہ طنز سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہارے پاس تو اب کچھ نہیں رہا نا''۔

''مجھے روپے پیسے کی طمع نہ پہلے تھی نہ اب ہے میں نے دولت کو کبھی عزت اور محبت پر ترجیح نہیں دی۔ اور علم حاصل کرنا میرا شوق ہے یہ کوئی جرم یا عیب تو نہیں ہے۔ میرے لیے علم سب سے بڑی دولت تھی اور اب بھی ہے یہی علم اگر کبھی میری روزی روٹی کا ذریعہ بننے کا کام آ جائے تو کیا برائی ہے اس میں؟''۔ وہ ہمت کر کے سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''علم کو ذریعہ بنانے کی کیا ضرورت ہے تمہارے پاس تو اور پھر بہت سے قیمتی ہتھیار موجود ہیں ...... اور دولت کی طمع کسے نہیں ہوتی تمہارے باپ کو بھی دولت کی طمع تھی۔ دولت کی خاطر ہی تو اس نے تمہیں پچاس ہزار روپے میں بیچ دیا تھا میرے ہاتھ، دولت تھی تو میں نے تمہیں خرید لیا تھا''۔ وہ تلخی اور طنز سے کی ہتک کرتے ہوئے بولا اس نے بہت دکھ اور تاسف سے اسے دیکھا اتنی ہتک اور بے عزتی کی توقع تو نہیں تھی اسے بادل خان سے وہ کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ مجھے اپنی دولت سے خرید نہیں سکے تھے۔ وہ تو قسمت کا لکھا تھا کہ میرا اور آپ کا ٹکراؤ ہو گیا۔ میں نے تو آپ کی شرافت دیکھ

کر اپنا آپ، آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا''۔

''تم بھی شرافت کے معنی جانتی ہو، یہ ڈائیلاگ کسی اور کے سامنے بولنا مجھے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے باپ کی بیٹی ہو اس کا کچھ اثر تو تم پر بھی ہوگا''۔ وہ طنزیہ اور ہتک آمیز لہجے میں بولا تو وہ چیخ کر بولی۔ میرا باپ مر چکا ہے اسے تو بخش دیجئے۔ آپ کو اپنے پچاس ہزار روپے چاہئیں ناں۔ تو وہ میں آپ کو دوں گی''۔

''کہاں سے دو گی؟''۔ وہ طنز سے ہنسا۔

''مجھے اگر اپنا آپ بھی بیچنا پڑا تو''۔

''ہاں یہ کی ناں تم نے اپنی اصلیت ظاہر کرنے والی بات''۔ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہی تو میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ تمہیں آگے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو بہت قیمتی ہتھیاروں سے لیس ہو۔ انہیں بیچ کر اپنی روزی روٹی آسانی سے کما سکتی ہو''۔

''بس کیجئے''۔ وہ توہین کے احساس سے سلگ کر چلائی اور جانے لگی تو اس نے فوراً اس کے راستے میں اپنی ٹانگ اڑا دی وہ ٹکرا کر اوندھے منہ نیچے آ گری۔ اس کا سر بری طرح میز کے کنارے سے ٹکرایا تھا اس نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے اسے دیکھا وہ بہت بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔ ستارہ نے ایک دم سے خود کو ایک بہت بڑے فیصلے کے لیے تیار کر لیا۔ مسٹر بادل خان ...... اگر مجھے بے عزت اور ذلیل و خوار ہی ہونا ہے تو ...... کیا گھر اور کیا باہر۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ نے مجھے لالچی اور حریص سمجھا ہے نا تو میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میں نے ...... آپ کو آپ کی رقم واپس لوٹا دی ہے۔ رہے زیورات تو وہ بھی آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ میں آپ کے پچاس ہزار بھی ...... انشاء اللہ بہت جلد لوٹا دوں گی اور یاد رکھئے کہ مجھے اگر اپنا آپ دولت کے عوض بیچنا قبول ہوتا تو میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر چلی نہ آتی۔ میں آپ کا گھر بھی چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ ...... آپ مرد لوگ عورت کو صرف اپنی تسکین اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کی عزت نہیں کرتے بلکہ اس کی عزت سے کھیلتے ہیں اور میں آپ کے ہاتھوں مزید کھلونا

نہیں بننا چاہتی۔ باپ اور شوہر کے گھر میں نہ سہی۔ اللہ کے در پہ تو بہت جگہ اور امان ہے۔ آپ کو آپ کا یہ دولت کدہ مبارک ہو میں جا رہی ہوں میرا کہا سنا معاف کر دیجئے گا''۔ وہ اپنا سر پکڑے میز پر دباؤ ڈال کر کھڑی ہو گئی اور جانے لگی تو چکرا کر صوفے پر جا گری۔ بادل خان جو اس کی گفتگو سن کر سناٹے میں آ گیا تھا اس کے گرنے پر جیسے ہوش میں آ گیا۔

'ہونہہ' دو قدم چلا نہیں جاتا گھر چھوڑ کر جاؤ گی۔ تم اس طرح مجھے لوگوں کے سامنے تماشا بنا کر نہیں جا سکتیں، چلو اٹھو کمرے میں جاؤ خبردار اگر باہر قدم نکالا''۔

وہ اس کی حالت کی پرواہ کیے بغیر بے رحمی سے بولا تو وہ خود کو بمشکل سمیٹ سکی اور مرے مرے بے جان قدموں سے چلتی بیڈ روم میں آ گئی۔ ڈرائنگ روم میں سے اپنا مختصر سامان اٹھا لائی۔ چادر میں اس کا کالج بیگ تھا جس میں اس کی چادر، تعلیمی اسناد اور تین جوڑے کپڑوں اور سات سو چوبیں روپے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے بیگ پر لپٹی چادر تہہ لگا کر بیگ میں رکھی اور اپنی اوڑھنے والی چادر نکالی اور بیگ کندھے پر لٹکا کر چادر کھولنے لگی تو بادل خان اندر چلا آیا۔ ستارہ نے آرام سے چادر اوڑھی اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ رک جاؤ ستارہ بیگم...... وہ غصیلے اور حاکمانہ لہجے میں چلایا۔

کس حیثیت سے رک جاؤں؟

اس نے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے سپاٹ لہجے میں پوچھا حیثیت بتاؤں تمہیں تمہاری حیثیت۔ مرو اِدھر''۔ بادل خان نے اس کا بازو بہت سختی سے پکڑا اور غصے سے بولتے ہوئے اسے بیڈ پر لا پٹخا۔ ستارہ تکلیف اور دکھ سے کراہ اُٹھی۔ اس گھر سے قدم باہر نکالنے کی کوشش کی تو ٹانگیں توڑ دوں گا تمہاری''۔ وہ غصے سے بولا اور دروازہ جاتے ہوئے اتنے زور سے بند کیا کہ ستارہ کا پورا وجود خوف سے لرز اُٹھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس میں تو رونے بولنے اور چیخنے چلانے کی ہمت اور سکت بھی نہیں رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ یونہی لیٹی رہی۔ اپنی آتی جاتی سانسوں کو سفر محسوس کرتی رہی۔ پھر خود بخود اسے نیند آ گئی۔ رات کا دوسرا پہر تھا جب

اس کی آنکھ کھلی اس نے خود کو اسی طرح اسی جگہ لیٹے پایا جہاں بادل خان اسے پٹخ گیا تھا۔ البتہ اس کی چادر اور بیگ اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا سائیڈ ٹیبل پر روشنی میں اسے اپنا بیگ ڈائیننگ ٹیبل کے کارنر پر رکھا دکھائی دے گیا اس کی چادر بھی۔ اس پر رکھی تھی۔ وہ ہمت باندھ کر اٹھ بیٹھی۔ بادل خان اپنی جگہ پر بہت سکون اور آرام سے سو رہا تھا۔ اس کا سلوک اسے یاد آیا تو اس کی جھیل کنول سی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ستارہ یوں کب تک آنسو بہاتی رہو گی۔ تم نے تو خود سے عہد کیا تھا کہ تم بادل خان کو اپنی محبت سے جیت لو گی۔ ابھی سے ہار گئیں''۔ اس نے دماغ سے اسے یاد دلایا۔ ''میں ہاری نہیں ہوں۔ تھک گئی ہوں آخر میں اپنی انا، عزت، نفس اور خودداری کا تماشا کب تک دیکھتی اور کہتی رہوں گی۔ میں نے اتنا نیچے گر کر بادل خان کو سنوارنا چاہا ان کی ہر زیادتی برداشت کرتے ہوئے محبت کا برتاؤ اپنایا اور ان کے ساتھ مگر وہ تو جیسے محبت کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہیں۔ میں نے بیوی کا حق ادا کرنا چاہا تو انہوں نے اسے مکر و فریب، ڈرامے بازی اور جھوٹ سے تعبیر کیا۔ میں کیا کروں؟''۔ وہ خود سے اُلجھتے ہوئے اندر ہی اندر بولی۔

'دصبر، برداشت اور انتظار۔ کیونکہ اب صرف تم ہی بادل خان کے نام سے منسلک نہیں ہو بلکہ تمہاری کوکھ میں نمو پانے والی ننھی زندگی بھی بادل خان کا عکس ہے۔ تم ان حالات میں کہاں جاؤ گی۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے صرف عزم اور حوصلہ ہی نہیں چاہیے ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک محفوظ سائبان بھی درکار ہوتا ہے۔ تم خود کو بچاؤ گی۔ یا آنے والے بچے کو سنبھالو گی۔ بادل خان کی شروع دنوں کی محبت کی یہ نشانی کیا در بدر لیے پھرو گی''۔ اس کے دل نے اسے سمجھایا تو وہ بے کل ہو کر بستر سے اُتر آئی۔

''بادل خان میرے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں کیا۔ ان کی محبت کی یہ نشانی اس کے برے اثرات سے محفوظ رہ سکے گی۔ اگر خدانخواستہ محبت کی یہ کونپل نمو پانے سے پہلے ہی ختم...... نہیں ایسا نہیں ہونے دوں گی میں''۔ اس نے اپنے اندر اپنے آنسوؤں کو اتارتے ہوئے بے قراری سے دل میں کہا۔

''تو بھول جاؤ سب کچھ اور ایک بار پھر ہمت کر کے میدان میں کود پڑو۔ بادل خان کا خیال رکھو مگر اس سے کسی بات پر بحث مت کرو۔ اسے غصے میں دیکھو تو خاموش ہو جاؤ اسی میں تمہاری اور تمہارے بچے کی خیریت ہے''۔ اس کے دماغ نے صلح دی۔

بادل...... کو تو علم ہی نہیں ہے کہ ان کی محبتوں نے میرے وجود کو کیسے رنگوں سے بھر دیا ہے وہ تو اپنی قربتوں کے اس نتیجے سے بے خبر ہیں اب تک''۔ اس نے دل میں سوچا۔

''تم تو باخبر ہونا تو خود خیال رکھو اپنا اب تمہاری زندگی تمہاری ہی نہیں ہے۔ تمہارے بچے کا بھی تم پر حق ہے۔ اس کے دماغ نے اسے سمجھایا تو اس نے گہرا سانس لیا اور سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ واش روم سے ہو کر آئی تو اسے بھوک نے ستایا وہ سیدھی کچن میں چلی گئی۔ بادل خان کی آنکھ اچانک کھلی تھی۔ اور وہ ستارہ کو غائب پا کر فوراً کمرے میں نگاہ دوڑاتا باہر نکلا تھا۔ تمام دروازے وہ خود سے اندر لاک کر کے سویا تھا اور اب اسی طرح لاک تھے۔ وہ کچن کی طرف آیا تو لائٹ جلتی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اس نے کچن میں جھانکا تو ستارہ کو کھانا کھاتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں کھایا تھا سو اندر داخل ہو گیا۔ ''میرے لیے بھی کھانا گرم کرو''۔ بادل خان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ستارہ نے خاموشی سے اُٹھ کر اس کے لیے کھانا گرم کیا اور اس کے سامنے میز پر رکھا اور خود بھی دوبارہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ بادل خان کا خیال تھا کہ وہ اب اس کے سامنے کھانا نہیں کھائے گی اور اُٹھ کر چلی جائے گی مگر اسے اطمینان سے کھانا کھاتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ مگر کوئی سوال جواب نہیں کیا اور کھانے میں مگن ہو گیا۔ ستارہ نے فارغ ہو کر برتن سمیٹے اور ساتھ ہی دھو کر رکھ دیے۔ اس سارے عمل میں انتہائی خاموشی چھائی رہی۔ بادل خان دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا اور وضو کر کے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ تہجد کی نماز ادا کرتے ہوئے اس کا انگ انگ اپنے رب کے حضور گڑگڑا رہا تھا۔ فریاد کر رہا تھا۔ صبر اور حوصلے کی دعا

مانگ رہا تھا۔ بادل خان کی واپسی کی دعا مانگ رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے ستارہ اور بادل خان میں ہونے والی گفتگو تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ستارہ اس کی چیزوں کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتی اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے غرض بادل خان کو اپنی ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر ملتی۔ ستارہ سلام دعا کے علاوہ اس سے بات کرنی کی کوشش کرتی تو وہ ہوں۔ ہاں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ وہ بے بسی سے سوچتی کہ آخر کب تک چلے گا؟ وہ نوٹ کر رہی تھی کہ بادل خان بہت اُلجھا ہوا اور پریشان رہنے لگا ہے۔ اس کے گرل اور بوائے فرینڈز نے بھی آنا بند کر دیا تھا۔ البتہ وہ خود صبح نو بجے کا گیا رات کے نو دس بجے گھر آتا تھا۔ اور وہ سارا سارا دن اکیلی اتنے بڑے گھر میں بولائی بولائی اور ہراساں پھرا کرتی۔ کبھی صائمہ بھابھی یا ان کے بچے آ جاتے تو تھوڑی دیر کو اس کا دھیان بٹ جاتا۔ ان کے جاتے ہیں وہ دوبارہ اکیلی ہو جاتی۔ انہیں دنوں رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو گیا۔ آج پہلا روزہ تھا۔ ستارہ نے سحری تیاری کرنے کے بعد بادل خان کو جگایا تو وہ غصے میں آتے ہوئے بولا۔ ''کیا مصیبت ہے لڑکی۔ سارے دن کا تھکا ہارا رات گئے گھر لوٹتا ہوں تم چین سے سونے نہیں دے سکتیں مجھے''۔

''سو جایئے گا لیکن پہلے سحری کر لیجئے صبح پہلا روزہ ہے''۔ اس نے نرمی سے کہا۔

''میں نے پہلے کبھی روزہ رکھا ہے جو اب رکھوں گا جاؤ جا کر اپنا کام کرو سونے دو مجھے''۔

بادل...... روزے تو فرض ہیں جان بوجھ کر روزے چھوڑنے کا بہت گناہ ملتا ہے۔ اس نے سمجھایا۔

میں آج تک گناہ ہی تو کماتا آیا ہوں ایک گناہ اور سہی وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔

پلیز بادل...... اٹھیئے نا۔ اس نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مجھے غصہ مت دلاؤ جاؤ یہاں سے''۔ وہ سخت لہجے میں بولا تو ناچار اسے

واپس پلٹنا پڑا۔ تین چار دن تو وہ اسے مسلسل جگانے کی کوشش کرتی رہی اور وہ بنا سوتا رہا۔ وہ خود باقاعدگی سے روزے رکھ رہی تھی۔ قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ نماز باقاعدگی سے ادا کر رہی تھی۔ اور بادل خان اسے دیکھے جاتا تھا۔ ایک چپ سی اس کے ہونٹوں پر لگ گئی تھی۔ ستارہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بیڈ پر آئی تو وہ جو اسے کتنی دیر سے عبادت میں مشغول وجود دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر نظریں چرا گیا۔ وہ اس کی چوری پکڑ چکی تھی۔ جبھی اس کے لبوں پر بڑی دلکش مسکان اُبھر آئی تھی۔

بادل ...... کیا بات ہے آپ اتنے چپ چپ کیوں رہنے لگے ہیں۔ آپ کے دوست بھی نہیں آئے آپ سے ملنے۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

''تم نے جوان کی عزت افزائی کی تھی اس کے بعد وہ یہاں کیا لینے آتے؟۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''چلیں یہ تو اچھا ہوا غلط قسم کے لوگوں سے آپ کا گھر تو محفوظ ہوا مگر...... آپ نے تو ڈرنک کرنا کیوں چھوڑ دی؟''۔

''تو کیا پھر سے ڈرنک شروع کر دوں؟'' اس نے اس کے مسکراتے پاکیزہ حسیں چہرے کو گھورا۔

''نہیں آپ ایسا نہیں کرے گے مجھ یقین ہے آپ پر''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیوں؟' ذرا اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''کیونکہ آپ بہت اچھے ہیں''۔

''اوشٹ اپ''۔ وہ غصے سے بولا۔ ''اور مجھے روز روز جگانے کی ضرورت نہیں ہے سحری کی وقت سنا تم نے''۔

''میں تو اپنا فرض پورا کرتی ہوں آگے آپ کی مرضی گناہ ملے گا آپ کو''۔ اس نے نرمی سے کہا۔

''یہ مرا اور میرے رب کا معاملہ ہے تمہیں درمیان میں آنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ گناہ ثواب میرا نصیب ہو گا تم کیوں میری آخرت کی فکر میں دبلی ہو رہی ہو''۔ وہ اسی لہجے میں بولا تو اس نے اس کے بالوں سے ہاتھ ہٹا لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں بیوی جو ہوں آپ کی اس لیے''۔

''بہت مہربانی آپ کی دوبارہ مجھے جگانے کی کوشش مت کیجیے گا''۔

مگر بادل......

''تم خاموش نہیں رہ سکتیں''۔ وہ فوراً اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''رہ سکتی ہوں''۔ وہ مسکرائی۔

''تو اب خاموش رہو، میرے کان مت کھاؤ تمہیں تمہاری آواز نہیں سننا چاہتا سمجھیں تم''۔ اس نے انتہائی رکھائی اور بے مروتی سے کہا۔

''یہ شخص جب بھی بات کرتا ہے دل آزاری اور ہتک کرتا ہے بادل...... آپ مجھ سے اس قدر نالاں ہیں کہ میری آواز بھی اب آپ کو ناگوار گزرنے لگی ہے''۔ اس نے دکھ سے دل میں کہا۔

''جی سمجھ گئی آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا''۔ ستارہ نے بظاہر بہت مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ بادل خان نے لائٹ آف کر دی۔ اور خود بھی اپنی جگہ پر آلیٹا۔

''بہت ہو گیا اب میں بھی نہیں بولوں گی جب بادل ...... کو میری آواز تک بری لگنے لگی ہے تو میں کیوں خود کو گراؤں۔ میں نے تو اپنی انا اور عزتِ نفس بھی پسِ پشت ڈال دی تھی صرف اس لیے کہ بادل کے دل میں جگہ بنا سکوں۔ اور رشتوں پر نہ سہی کم از کم اپنے رشتے سے تو ان پر اعتبار قائم کر سکوں مگر شاید وہ اعتبار کرنا ہی نہیں چاہتے۔ بس اب میں ان سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اب صرف اللہ سے مدد مانگوں گی''۔

ستارہ نے دل میں کہا اس کی پلکوں سے دو ستارے ٹوٹ کر اس کے بالوں میں جذب ہو گئے اور پھر ستارہ نے ایسی چپ سادھی کہ بادل خان کو اس کی خاموشی سے

وحشت سی ہونے لگی۔ اب تو وہ رسمی سی سلام دعا بھی اس نے ترک کر دی تھی۔ بادل خان اندر ہی اندر بے چین اور بے کل رہنے لگا تھا۔ وہ نہ اسے سحری کے وقت جگاتی نہ ہی صبح آفس جانے کے لیے جگاتی البتہ ٹائم واچ میں الارم لگا کر رکھ دیتی اور الارم بجنے پر وہ صبح بیدار ہو جاتا۔ اس کے کپڑے، جوتے ہر چیز تیار ہوتی وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آتا گرم گرم ناشتہ اس کا منتظر ہوتا وہ ناشتہ کر کے خاموشی سے آفس چلا جاتا۔ شام کو بھی چائے اور کھانا اسی خاموشی سے اس کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اب تو وہ اپنی کہی بات پر پچھتا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ستارہ اس کی بات اتنی سنجیدگی سے لے گی اور بالکل ہی خاموش ہو جائے گی۔

کل پندرھواں روزہ تھا۔ ستارہ سحری کے وقت کچن میں اپنے لیے کھانا گرم کر کے ابھی کھانا شروع ہی کر رہی تھی۔ کہ بادل خان کو کچن میں دیکھ کر اسے بے حد حیرت ہوئی مگر وہ بولی اب بھی کچھ نہیں تھی۔ بادل خان کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا اور ہاٹ پاٹ کھولتے ہوئے بولا۔

"میرے لیے بھی سالن پلیٹ میں نکال دو"۔ بادل خان نے خالی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

اس نے سالن اس کی پلیٹ میں نکال دیا۔ اور دہی اور دودھ میں بنی پھونیاں پلیٹوں میں ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی اور اس کے لیے تازہ روٹی پکانے کی غرض سے اٹھی تو اس نے فوراً پوچھا۔

"اُٹھ کیوں گئیں؟"۔

"آپ کے لیے تازہ پھلکا بنا دیتی ہوں"۔ ستارہ نے بھی بالاخر اپنی چپ کا قفل کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں یہی کھالوں گا تم بیٹھو سحری کرو"۔ وہ نرمی سے بولا۔

"بس دو منٹ۔ آپ یہ دہی اور پھینیاں لیجئے"۔ اس نے برف پگھلتی دیکھ کر نرمی سے کہا اور آٹا فریج سے نکال کر جلدی جلدی اس کے لیے پھلکا بنانے لگی۔ بادل خان کھانے کی بجائے اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ ہلکے سرمئی رنگ کے گرم شلوار قمیض

پر اس نے سفید اور سیاہ کنٹراسٹ کی دوپٹہ نما گرم شال شانوں پر پھیلا رکھی تھی۔ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنی ہوئی تھی۔ اس کی گلابی رنگت سفید ہو رہی تھی وہ اسے پہلے سے کمزور دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ لیجئے، ارے آپ نے تو کھانا ہی نہیں شروع کیا"۔ وہ پھلکا بنا کر اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی تو وہ چونک گیا اور پلیٹ پر نظریں جھکا کر بولا۔

"بس میں ایک پھلکا ہی کھاؤں تم بیٹھو کھانا شروع کرو"۔

"جی"۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور خاموشی سے خود بھی سحری کرنے لگی۔ سحری کر کے بادل خان واپس کمرے میں چلا گیا۔ ستارہ نے برتن سمیٹ کر رکھے اور وضو کر کے بیڈروم میں پہنچی تو بادل خان کو فجر کی نماز ادا کرتے دیکھ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

بادل ...... میں نہ کہتی تھی کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے دل میں کہا۔ خوشی سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے فرض اور ذمہ داری کو پہچان رہا تھا۔ ستارہ کی اُمید اور آس کے سارے دیئے جگمگا اُٹھے۔ صائمہ بھابھی اسے کئی دن سے عید کی شاپنگ کے لیے اپنے ساتھ لیجانے کے لیے مجبور کر رہی تھیں۔ مگر وہ مان ہی نہیں رہی تھی ایک تو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شاپنگ کرتی بھی تو کس کے لیے بادل خان اس کا شوہر تو اس گریزاں اور نالاں تھا۔ اور دوسرا اس کے پاس شاپنگ کے لیے رقم بھی نہیں تھی۔ لیکن اب وہ شاپنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اور بیوی کی حیثیت سے بادل خان سے رقم لینے کا سوچ رہی تھی۔ مگر مانگنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اور پھر اسے بادل خان کی باتیں بھی روکے ہوئے تھیں۔ لیکن صبح تو اسے بہت حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب بادل خان نے اس سے پوچھا۔

"تم صائمہ بھابھی کے ساتھ شاپنگ کے لیے کیوں نہیں جا رہیں، تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟"

"جی وہ ......وہ حیرت سے اس کی صورت تکنے لگی۔

''یہ رکھ لو اور اپنی اور گھر کی ضرورت کی چیزیں خرید لینا''۔ بادل خان نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سفید رنگ کا لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ اور اسے حیران چھوڑ کر آفس کے لیے چلا گیا۔ ستارہ نے لفافہ کھول کر دیکھا اس میں ہزار ہزار کے نئے نکور کئی نوٹ تھے اس نے گنے وہ پورے بیس ہزار روپے تھے۔ اتنی بڑی رقم اس نے اپنے ساتھ نہ جانے کی شکایت کی تھی اور بادل خان کو خود ہی خیال آیا تھا کہ ستارہ رقم نہ ہونے کے باعث ان کے ساتھ جانے سے انکار کر رہی ہو گی۔ جبھی اس نے اسے رقم دی تھی۔

''بادل ...... آپ بہت اچھے ہیں''۔ ستارہ نے رقم لفافے میں رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے باآواز کہا اور کچھ دیر بعد گھر کے کام سے فارغ ہو کر صائمہ بھابھی کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی گئی اس نے بادل خان کے لیے ایک سفید شلوار قمیض اور ایک کرتا شلوار کا کپڑا خریدا اور سلنے کے لیے دے دیا۔ اس کے لیے جوتے، پرفیوم اور باڈی اسپرے وغیرہ بھی خریدا۔ اپنے لیے ضروری چیزوں کے علاوہ صائمہ بھابھی کے اسرار پر ایک سوٹ اور جیولری سیٹ خریدا۔ کچن آئٹمز خریدنے کے بعد صائمہ بھابھی نے اس کا اپنے کلینک میں لے جا کر مکمل طبی معائنہ کیا۔ اس کی رپورٹس ٹھیک تھیں۔ بس اسے بہتر غذا کی اور خوش رہنے کی تاکید کی تھی انہوں نے۔ اور وہ خوش تو تھی بادل خان کے رات سحری کے وقت کے خوشگوار عمل سے۔ آج اس نے افطاری پر خوب اہتمام کے ساتھ بادل خان کی پسند کی ڈشز بنائی تھیں۔ جو اس نے بہت رغبت سے کھائی تھی۔ عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے لیے وہ مسجد گیا تھا اور آ کر سو گیا تھا۔ ستارہ کو اس کی شخصیت میں اس مثبت تبدیلی سے بہت سکون ملا تھا۔ اگلی صبح سحری کے وقت وہ بھی اس کے ساتھ ہی جاگ گیا تھا۔ جتنی دیر وہ سحری بنانے میں لگی رہی بادل خان تہجد کی نماز ادا کر کے فارغ ہو گیا دونوں نے خاموشی سے سحری کی۔ نماز ادا کی قرآن پاک پڑھا اور سو گئے۔ اب تو روز کا معمول بن گیا تھا۔ بادل خان باقاعدگی سے روزے رکھ رہا تھا۔ عبادت کر رہا تھا۔ ستارہ نے عبادت کے ساتھ ساتھ گھر کی صفائی بھی آہستہ آہستہ کر رہی تھی۔ اتنے بڑے گھر کی

صفائی ستھرائی تو ہو گئی تھی لیکن ساتھ ہی وہ دن بھری مشقت سردی اور اپنی موجودہ حالت کے باعث بیمار بھی ہو گئی۔ آج چوبیسواں روزہ تھا۔ سحری کے وقت گھڑی کا الارم بجنے کا باوجود وہ نہیں جاگی تھی۔ بادل خان کی آنکھ کھل گئی تھی اور الارم بند کر کے پھر سے سونے لگا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب اسے کمرے میں لائٹ جلتی نہیں دکھائی دی تو اس نے ٹیبل لیمپ جلا کر گھڑی میں ٹائم دیکھا تو اُچھل کر اُٹھ بیٹھا۔ سحری کا وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے اپنے دائیں جانب نگاہ ڈالی تو ستارہ کو بے سدھ سوتے دیکھ کر ٹھٹکا۔

''یہ کیوں نہیں جاگی اب تک؟''۔ اس نے فکر مند ہو کر سوچا اور پھر آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ ستارہ اٹھو آج روزہ نہیں رکھنا کیا؟۔

اونو...... وہ اس کی کیفیت سے خاموشی سے پریشان ہو گیا تو اس کی پیشانی کو چھوا تو اسے احساس ہوا کہ اسے تو بہت تیز بخار تھا۔

اب کیا کروں ...... پہلے خود تو سحری کر لوں وقت ختم ہو جائے گا۔ وہ خود کلامی کرتا ہوا بیڈ سے اترا لائٹ آن کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ کچن میں آ کر فریج سے ڈبل روٹی اور جام نکالا دودھ گرم کیا اتنی دیر میں ڈبل روٹی ٹوسٹر میں سنیک گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ڈبل روٹی پر جام کی تہہ لگائی اور دودھ کے ساتھ کھا کر واپس کمرے میں آ گیا۔ ستارہ اب تک اسی طرح سو رہی تھی۔ بادل خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت وہ اسے کیا ٹریٹمنٹ دے ڈاکٹر کو بھی نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ اسے ایک دم صائمہ بھابھی کا خیال آیا ان کا گھر تو سامنے ہی تھا اور اس وقت وہ بھی یقیناً سحری کے لیے بیدار ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہیں اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر فون سے ان کا نمبر ملایا۔ فون انور یزدانی نے ریسیو کیا تھا۔ بادل خان نے انہیں اپنی پریشانی بتائی تو وہ صائمہ بھابھی کو لے کر پانچ سات منٹ میں ''بادل ہاؤس'' میں موجود تھا۔ صائمہ بھابھی ستارہ کا چیک اپ کرنے کمرے میں چلی گئیں، ا... یزدانی، بادل خان سے باتیں کرنے لگے۔

بادل یار ...... تم میری سمجھ سے تو باہر ہو۔ ایک طرف تو تم نے بھابھی کو ا...

بڑے سے گھر میں تنہا کر رکھا ہے۔ ملازموں کی بھی چھٹی کر دی عرصہ ہوا۔ اور دوسری طرف یہ حال ہے جناب فجر کے وقت اندھیرے میں ستارہ بھابھی کے لیے ڈاکٹر کی ضرورت محسوس کر رہے ہو۔ اور بلا بھی چکے ہو آخر معاملہ کیا ہے؟ انور یزدانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے بیمار لوگ اچھے نہیں لگتے''۔ وہ پریشانی میں ٹہلتے ہوئے جھلا کر بولا تو انور یزدانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور صحت مند لوگوں سے تم ویسے ہی خار کھاتے ہو''۔

بھابھی...... کیا ہوا ستارہ کو وہ دن بدن کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟''۔

بادل خان نے صائمہ بھابھی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی ان سے سوال کیا لہجے میں بے چینی نمایاں تھی۔ صائمہ بھابھی مسکرا دیں۔ اور پھر معنی خیز لہجے میں بولیں۔

''یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں بادل بھائی...... کیا ستارہ نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''۔

''نہیں''۔ وہ بولا تو انہوں نے کہا۔

''تو میں کیسے بتا سکتی ہوں، یہ تو ستارہ ہی آپ کو بتائے گی میں صرف اتنا کہوں گی اگر آپ اس کی زندگی چاہتے ہیں تو اس کا خیال رکھیے۔ اسے اچھی خوراک سے زیادہ اصلی اور حقیقی خوشی کی ضرورت ہے۔ یہ سیرپ صبح منگوا لیجیے گا اور ناشتے اور کھانے کے بعد دو دو چمچ اسے پلایئے گا انشاء اللہ بخار اتر جائے گا یہ ہومیو پیتھک سیرپ ہے ایسی حالت میں ہم اسے ایکسٹرا اسٹورنگ میڈیسن نہیں دے سکتا اس کے لیے بہتر نہیں ہوگا''۔

صائمہ بھابھی نے ایک چٹ پر سیرپ کا نام لکھ کر اسے چٹ تھما دی۔ اس نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے چلے جانے کے بعد خود بیڈ روم میں آ گیا۔ ستارہ اب بھی محو خواب تھا۔ وہ چند منٹ کھڑا اس کی صورت پر پھیلی اداسی اور معصومیت کو تکتا رہا۔ پھر وضو کر کے نماز کے لیے نکل گیا۔

صبح کے دس بج رہے تھے۔ جب ستارہ کی آنکھ کھلی۔ اسے وقت گزرنے نماز اور سحری کا وقت نکل جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ نماز تو اس نے ہمت کر کے قضا پڑھ لی تھی۔ ساتھ ہی روزے کی نیت بھی کر لی۔ اُلجھے، بکھرے بالوں کو برش کر کے ہیئر بینڈ میں مقید کرتے ہوئے اسے بادل خان کا خیال آیا۔

بادل...... نے بھی بغیر سحری کے روزہ رکھا ہوگا۔ وہ غصے ہوں گے میں اُٹھ ہی نہیں سکی سحری کے وقت۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں ہیں گھر میں کہ آفس میں''۔

اس نے دل میں سوچا اور بالوں کو باندھنے کے بعد شال اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی اور کمرے سے باہر نکلی تو اسے گھر میں غیر معمولی ہلچل سی محسوس ہوئی کسی کے بولنے کی آوازیں بھی اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ تو اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کون ہے یہاں''۔

''ہم ہیں بیگم صاحبہ...... السلام علیکم۔ بادل خان کا کک رشید اور اس کی بیوی شکیلہ اس کی آواز سن کر اس کے پاس چلے آئے۔ وہ حیران ہوئی انہیں یہاں دیکھ کر۔

وعلیکم السلام...... آپ دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں؟

بیگم صاحبہ ہمیں بادل صاحب نے رات فون کر کے کہا تھا کہ ہم فوراً یہاں پہنچ جائیں اور اپنا کام سنبھالیں تو ہم تینوں صبح ہوتے ہی ادھر آ گئے''۔ رشید نے بتایا۔

''تینوں''۔ اس نے حیرت سے کہا تو وہ بولا۔ وہ جی مالی شمشیر بھی ہمارے ساتھ آیا ہے باہر لان کی صفائی وغیرہ دیکھ رہا ہے آپ نے تو جی اکیلی نے سارا گھر چمکا دیا ہے ہم تو چار چار نوکر مل کر پورے گھر کا کام کرتے تھے۔

''اسی لیے تو بیگم صاحبہ کمزور ہو گئی ہیں''۔ شکیلہ نے اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تین ماہ تک آپ لوگ کہاں تھے اور کیا کرتے رہے؟'' ستارہ نے صوفے پر

بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جی ہمیں صاحب نے اپنے ایک دوست کے گھر ملازمت دلوائی تھی۔ انہیں ملازم کی ضرورت تھی مالی اور کک کی بھی تو ہم تینوں وہاں کام کر رہے تھے۔ صاحب جی نے حکم دیا تھا کہ جب میں واپس ادھر بلاؤں تو فوراً آ جانا۔ تو ہم آ گئے ہیں جی''۔

''کیا ان کے دوست نے ملازموں کا بندوبست کر لیا ہے؟''۔ ستارہ نے پوچھا۔

''نہیں جی صاحب نے تو ان سے دس بارہ دن پہلے بات کی تھی کہ اپنے ملازموں کا بندوبست کر لو۔ وہ مذاق سمجھتے رہے اب جب ہم سویرے سویرے ان کے گھر سے آ رہے تھے تو انہیں بہت حیرانگی ہوئی۔ اب وہ کرتے رہیں اپنے لیے ملازموں کا انتظام ہمارا اصل ٹھکانہ تو یہ گھر ہی ہے جی''۔ شکیلہ نے سنجیدگی سے بتایا۔

''ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں کام کریں اپنا''۔ ستارہ نے صوفے کی بیک سے اپنا سر ٹکا کر کہا۔ بیگم صاحبہ آپ کے لیے ناشتہ لاؤں''۔ شکیلہ نے پوچھا۔

''میرا روزہ ہے''۔ اس نے بتایا تو وہ حیران ہو کر بولی۔ ''پر آپ کو تو بخار تھا''۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا تو وہ بولی۔ ''صاحب جی نے بتایا تھا''۔

''ہاں لیکن میں نے روزہ رکھ لیا ہے''۔ اس نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ نے تو جی کمال کر دکھایا ہے بادل صاحب ...... نے کبھی روزہ نہیں رکھا تھا اب تو وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ پرسوں ادھر اپنے دوست کی طرف آئے تھے تو چائے پانی پینے سے انکار کر دیا تھا۔ بتا رہے تھے کہ روزہ ہے''۔ رشید نے مسکراتے

ہوئے بتایا۔

''انہیں اگر پہلے کسی نے روزے کی اہمیت اور فضیلت سے آگاہ کیا ہوتا تو وہ پہلے بھی روزے رکھتے۔ اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ خود دل سے اپنی مرضی سے روزے اور عبادت کی پابندی کر رہے ہیں اور ہم سب کو پابندی کرنی بھی چاہیے''۔

ستارہ نے سنجیدگی سے کہا اور اُٹھ کر باہر لان میں آ گئی۔ مالی نے اسے دیکھ کر سلام کیا۔ اس نے حال احوال پوچھا تو وہ خوش ہو گیا اور اپنے کام میں لگ گیا تو وہ لان چیئر پر آ بیٹھی۔ اور میز پر رکھا رول شدہ اخبار اُٹھا کر کھولنے لگی۔

''تو بادل ...... آپ کو میرا خیال آ رہا ہے آہستہ آہستہ''۔ اس نے دل میں کہا اور اخبار کی ورق گردانی کرتے کرتے ہیں تھک کر آنکھیں موند لیں۔ بادل خان اس کی دوا لے کر آیا۔ اسے لان میں بیٹھا دیکھ کر وہیں آ گیا۔ اس نے دیکھا دھوپ اور بخار کی تپش نے اس کی گلابی رنگت کو مزید گہرا کر دیا تھا۔

بادل ...... اس کا کیا قصور ہے؟ تم اوروں کی بے وفائی اور بے حسی کی سزا اس معصوم کو کیوں دے رہے ہو؟''۔ اس کے اندر سے آواز آئی تو اس کا دل چاہا کہ اسے اٹھا کر اپنے سینے میں چھپا لے اور اس کے سارے درد، سارے آنسو اپنے اندر اتار لے۔ مگر وہ یہ سوچ ہی چکا اور سر جھٹک کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ آہٹ سن کر ستارہ نے آنکھیں کھول دیں۔

السلام علیکم ...... ستارہ نے اس کی چہرے کو دیکھ کر آہستگی سے سلام کیا۔

وعلیکم السلام ...... تم نے ناشتہ کر لیا ہے تو یہ سیرپ پی لو۔ اس نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور دوا کا لفافہ میز پر رکھ دیا۔

''لیکن میرا تو ...... روزہ ہے''۔ وہ ڈرتے ہوئے بولی تو وہ حیرت سے اسے تکنے لگا۔

"ایک تو تم نے بخار چڑھالیا ہے اوپر سے روزہ بھی رکھ لیا ہے وہ بھی بغیر سحری کیے۔ شاباش ہے بھئی۔ ایک روزہ نہ رکھتیں تو کیا نیکیاں کم ہو جاتیں تمہاری؟"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو اس نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "سردی کے روزے میں بھوک پیاس کا پتہ تھوڑی چلتا ہے"۔

"بخار کا تو پتہ چلتا ہے نا"۔ وہ سخت سپاٹ لہجے میں بولا۔ "لوگ تو یہی کہیں گے کہ میں تمہیں کچھ کھانے کو نہیں دیتا تم پر ظلم کرتا ہوں"۔

"جب میں نے آپ سے ایسا کچھ نہیں کہا تو لوگ کیوں کہیں گے؟"۔

"دیکھنے والے، بلا کی نظر رکھتے ہیں ستارہ بیگم...... وہ اسی لہجے میں بولا۔ اور آپ کسی کی زبان نہیں پکڑ سکتیں"۔

"سوری...... میں خیال رکھوں گی، معمولی سا بخار ہے اُتر جائے گا آپ فکر نہ کریں"۔

"مجھے آپ کی فکر ہے بھی نہیں"۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا اور اُٹھ کر اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"آپ کو میری فکر نہ ہوتی تو یہ دوا کیوں لاتے آپ؟"۔ اس نے میز پر رکھے دوا کے لفافے کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا اس کے ہونٹوں پر بہت مسرور کن اور دلنشین مسکان سج گئی تھی۔

ملازموں کے آنے سے آرام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ دوا وقت پر کھانے، آرام کرنے اور قدرے ذہنی طور پر ریلیکس ہونے سے اس کا بخار تو اگلے دن ہی اتر گیا تھا۔ کمزوری بھی آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اس نے عید کی تیاری تو مکمل کر لی تھی مگر اسے عید کی خوشی مکمل ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کی دعا مانگتی۔ آج انتیسواں روزہ تھا۔ بادل خان روزہ کھولنے کے بعد نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

ستارہ کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ وہ نماز سے فارغ ہوئی تو ٹی۔ وی اور مساجد سے عید کا چاند نظر آنے کا اعلان سنائی دیا۔ اس نے ماہِ رمضان خیریت سے گزر جانے پر شکرانے کے دو نفل ادا کیے۔ اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ اس کی نگاہیں عید کے چاند کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور دل اپنے دل کی چاند کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں نے عید کی چاند کی جھلک دیکھ لی۔ اس کا دل ایکدم بہت بے قرار ہو کر بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

"عید کا چاند تو آسمان پر نمودار ہو چکا ہے لیکن میرا چاند کہاں ہے میری خوشیوں کا میری عید کا چاند کس بادل میں چھپا ہوا ہے۔ بادل خان...... بادل تو اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس کے آغوشِ وسعت میں سینکڑوں چاند سما سکتے ہیں ہزاروں ستارے جگمگا سکتے ہیں۔ کیا آپ کے دامنِ وسعت میں آپ کی آغوشِ محبت میں ایک ستارہ کے لیے بھی جگہ نہیں ہے۔ کیا میری پہلی عید شادی کے بعد کی یہ پہلی عید یونہی بے رنگ، بے کیف، اداس اور مایوس گزر جائے گی۔ بتایئے نا بادل...... کیا میں یونہی آپ کی محبت کو ترستی رہوں گی؟"۔ ستارہ نے آسمان کو تکتے ہوئے اپنے دل میں بادل کو مخاطب کر کے کہا اس کی پلکوں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ اس نے چاند کو دیکھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ تو ایک ہی دعا اس کے دل سے نکلی۔

"یا اللہ...... میری یہ عید میرے شوہر کو محبتوں اور رفاقتوں سے مزین کر دے"۔

اور دعا کے دل سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پوری طرح بادل خان کے حصار میں آ گئی ہو۔ اس کے دعا کے لیے پھیلے گلابی نرم ملائم ہاتھوں کے نیچے بادل خان کے مضبوط مردانہ ہاتھوں نے ہالہ بنا لیا ہو۔ اسے بادل خان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہو سکتی ہیں؟"۔ اس نے حیرت سے

سوچا۔

ستارہ ...... بادل خان کی پیار بھری پکار اس کی سماعتوں کے بے حد قریب اُبھری تھی۔ وہ تو جیسے ہوش میں آ گئی۔ یہ کوئی وہم یا خواب نہیں تھا وہ سچ مچ موجود تھا اسے اپنے حصار میں مقید کیے بڑے پیار سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی موجودگی اور قربت کے احساس نے اس کے جسم و جاں میں جیسے نئی روح پھونک دی۔ اس پر تو شادی مرگ طاری ہو گئی۔ اس نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا وہ بادل کی طرح اس کے سر پر سائبان بنا کھڑا تھا۔ ستارہ کی آنکھوں میں حیرت تھی بے پناہ حیرت۔ دونوں مل کر دعائیں مانگیں۔ ستارہ۔ بادل خان نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا تو ستارہ کی نظریں دوبارہ اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر جم گئیں۔ جو بادل خان کے ہاتھوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے اندر ایک طوفان مچل رہا تھا۔ وہ ابھی تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

یا اللہ...... یا رحمٰن...... ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ کرنا، ہمیں ایک دوسرے کی محبتوں سے آخری دم تک سرشار رکھنا۔ چاند رات کی ان ساعتوں سمیت ہماری زندگی کی تمام چاند راتوں کو خوشیوں اور چاہتوں سے نوازنا۔ ہمیں اپنے کرم کے سائے میں رکھنا۔ ایک دوسرے سے کبھی جدا اور بدگمان نہ کرنا۔ آمین۔ ستارہ تم بھی بولو آمین۔

بادل خانؔ نے بہت جذب سے دعا مانگنے کے بعد اس سے کہا اسے ہوش ہی کہاں تھا وہ تو اس کے ایک ایک لفظ سے اس کے لمس سے اپنے حواس کھوئے جا رہی تھی۔

''آمین کہو ستارہ''۔ بادل خان نے پیار سے کہا وہ بول ہی نہ سکی دل ضرور بول رہا تھا۔ ''بولو ستارہ آمین''۔ اس نے دوبارہ بڑے پیار سے کہا تو وہ لرزتی بھیگتی آواز میں بولی۔

''آ...... مین''۔ اور بولتے ہی وہ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بادل خان نے اسے چپ کرانے کی کوششیں نہیں کی۔ کیونکہ ان آنسوؤں کا سبب وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اس کا رخ پھیر کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اور زیادہ بلک کر رونے لگا۔ جب وہ خوب رو چکی تو اس نے اس کے آنسو کے آنچل سے صاف کیے۔ اور اسے اپنے محبت کے حصار میں سمو کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ نہیں بول رہی تھی بس اسے حیرت سے تکے جا رہی تھی۔

آئی ایم سوری ستارہ...... میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے پلیز آج کی اس مبارک گھڑی کے طفیل اس چاند رات کے صدقے مجھے معاف کر دو۔ آئی لو یو ستارہ......

آئی رئیلی لو یو...... اس نے ستارہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگانے بعد دل سے اپنی زیادتیوں اور محبتوں کا اعتراف کیا تو وہ خود اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو گئی۔

''آپ...... بدل کیوں گئے تھے؟''۔ اس نے بھیگتی آواز میں پوچھا۔

''دل سے تو نہیں بدلا تھا ستارہ''۔ اس نے اس کے بالوں کو نرمی سے چھیڑتے ہوئے کہا۔

اس میں چونکہ عورت ذات سے بددل اور بدگمان تھا اس لیے تمہیں آزما رہا تھا۔ جانتی ہو۔

''کیوں؟''......

ستارہ نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

کیونکہ میں تمہیں بے پناہ چاہنے لگا تھا۔ مجھے تم سے بے حد پیار تھا ستارہ...... اور میں ڈرتا تھا کہ اگر تم بھی زرقا اور گولڈی جیسی نکلیں تو میں کیا کروں گا۔ مجھے خوف

تھا کہ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کیسے جی پاؤں گا۔ تمہارے بغیر جینے کا تصور ہی میری جان نکالنے لگتا تھا۔ اس لیے...... اسی لیے ستارہ...... میں نے تمہیں ہر اعتبار سے ہر پہلو اور ہر لحاظ سے آزمانا شروع کر دیا۔ جوں جوں میں تمہیں آزماتا گیا۔ میں اپنی ہی نظروں میں گرتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ تم دولت کی چمک دمک میں کھو کر زرقا اور گولڈی جیسی بن جاؤ گی مجھے بھول جاؤ گی۔ کیونکہ اکثر غریب لڑکیاں امیر ہونے کے بعد اپنا رنگ ڈھنگ ہی بدل لیتی ہیں۔ مگر تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ سادگی، قناعت اور شرم وحیا کی تصویر بن گئیں تم۔ زرقا کو میں نے ڈائمنڈ سیٹ دے کر بھیجا تمہارے پاس''۔

''آپ نے''...... اس نے حیران ہو کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں ندامت اور محبت ایک تھی۔

ہاں ستارہ...... میں نے اسے بھیجا تھا کیونکہ وہ تمہیں اپنے جیسا بنانا چاہتی تھی اور میرا دل کہتا تھا کہ تم ان جیسی نہیں بن سکتیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم بھی تو دوسری لڑکیوں کی طرح قیمتی زیورات کی دلدادہ تو نہیں ہو مگر تم نے جس طرح زرقا کو مایوس لوٹایا اور جو کچھ کہا وہ اس نے ریکارڈ کر لیا تھا میں نے سنا تھا کئی بار سنا تھا تمہارا ایک ایک لفظ میری روح کو سرشار کر گیا اور مجھے اپنی اس گھٹیا حرکت پر شرمندہ۔ تم نے میرے دوستوں مظہر اور جاوید کو جس طرح اگنور کیا۔ جاوید کی بیہودہ گفتگو پر جس شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ تمہارے کردار کی مضبوطی کا ثبوت اور مظہر تھا۔ تم ڈنر کی رات مظہر کے واہیات جملے پر غصے میں کمرے میں بند ہو گئیں۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ میں ہر قدم تمہیں آزماتا رہا اور تم نے قدم قدم پر مجھے شکست سے دوچار کیا۔ میں حیران تھا کہ تم اتنی کم عمر ہو۔ ایک غریب گھر کی لڑکی ہو۔ خوبصورت ہو پھر کیسے میری زیادتیاں برداشت کیے جا رہی ہو اور اس ماحول کی رنگینیوں سے خود کو بچا بچا کر رکھ رہی ہو بس تمہارے اس مثبت اور پاکیزہ ردعمل نے مجھے اندر ہی اندر

شرمسار کیے رکھا میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا مگر اپنی انا، خودداری اور مردانگی کے زعم سے، نشے سے باہر نکل پاتا تھا اور جھلا کر تم پر پھر سے غصے ہونے لگتا تھا۔ تم نے میری ہر زیادتی کا جواب اپنی محبت اور مسکراہٹ سے اپنائیت سے دیا۔ میں بھی محبتوں کو ترسا ہوا شخص تھا اور تم بھی پیار کی متلاشی تھیں...... پھر میں اتنا کم ظرف کیوں نکلا ستارہ اور تم اتنی کشادہ ظرف کیوں ہو کہ مجھے...... تم نے صحیح معنوں میں محبت کرنا سکھا دیا ہے۔ ہمارا دکھ ایک تھا پھر میں کیوں تمہارے دُکھ نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اوروں کی بے وفائی اور زیادتیوں کا بدلہ تم سے کیوں لیا ستارہ۔ تم نے تو مجھ سے ہر بُرائی چھڑا دی۔ برے دوست، بیئر، سب کچھ...... میں خود بخود تمہاری کہی ہوئی باتوں پر عمل کرتا چلا گیا کیوں ستارہ؟۔

''کیونکہ آپ بہت اچھے ہیں''۔ اس نے اس کے انکشاف سن کر سکون کا سانس لے کر کہا۔

''سب کچھ جان کر بھی تم مجھے اچھا کہہ رہی ہو''۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''تمہیں غصہ نہیں آ رہا مجھ پر''۔

''نہیں پہلے آیا تھا''۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''جب آپ کے دوست مظہر نے میرے ساتھ بدتمیزی کی آپ نے اسے کچھ نہیں کہا حالانکہ آپ سامنے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔

بتایا نہ جانِ بادل...... میں تمہیں پرکھ رہا تھا۔ آزما رہا تھا۔ وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔

اور وہ خبیث جاوید...... جانتے ہیں اس نے کیا بکواس کی تھی وہ سب لوگ آپ کی غیر موجودگی میں یہاں آئے تھے۔ اگر وہ اپنی کمینگی میں کامیاب ہو جاتے تو...... دھری رہ جاتی آپ کی ساری آزمائش...... اور آپ نے تو...... مجھے ہی الزام دینا تھا نا''۔ وہ روہانسی ہو کر بولی ہرگز نہیں، وہ ایسا کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ میں

وہی تھا ستارہ...... تمہارے آس پاس میں انہیں بھی جانتا تھا...... اور تمہیں بھی ...... تم
اگر خدانخواستہ لوز کریکٹر کی ہوتیں۔ تب بھی شاید میں تمہیں ان کے ہاتھ نہیں لگنے
دیتا۔ کیونکہ تم میری بیوی تھیں۔ میری عزت غیرت اور محبت تھیں۔ تمہارا ہر ردعمل
میرے دل میں تمہاری محبت میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ تم نے اپنی محبت واپنائیت سے
اپنی وفا شعاری، ثابت قدمی، صبر وتحمل اور پاکیزہ سیرت کی بدولت میرے تمام
خدشے، خوف اور ڈر دھو ڈالے ہیں ستارہ...... میں میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔
اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری جیسی پیاری پیار کرنے والی بیوی سے
نوازا ہے۔ ورنہ میں اس قابل تو نہیں تھا کہ تم ایسی حسین اور پاکیزہ سیرت لڑکی میری
ہمسفر بنتی۔ تم نے مجھے اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لا کھڑا کیا ہے ستارہ۔

اور ہاں ستارہ...... تم نے جو پانچ لاکھ روپے دے کر میری پریشانی دور کی تھی وہ
تمہاری ایک اور خوبی تھی۔ میرا نہیں خیال تھا کہ تم مجھے...... اپنی رقم اور زیورات
دے دو گی''۔

''تو کیا وہ پریشانی بھی جھوٹی تھی میری آزمائش کا حصہ تھی؟''۔ ستارہ نے
پوچھا۔

''نہیں ستارہ جانی...... میں حقیقتاً میں بہت پریشان تھا۔ تم نے رقم دے کر مجھ پر
احسان کیا تھا۔ اس رقم سے پےمنٹ ہو گئی تھی اور میرا کیشیئر بھی اگلے روز ہی رقم لے
کر میرے آفس پہنچ گیا تھا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا ستارہ کہ ہوسکتا ہے کہ اس کی کوئی
مجبوری ہو۔ وہ واقعی مجبور تھا۔ عید کے فوراً بعد اس کی دو بہنوں کی شادی ہونا ہے اور
اس کے جہیز کے پاس رقم نہیں تھی۔ اس لیے اس نے وہ پندرہ لاکھ روپے غائب کیے
تھے مگر اس کے ضمیر نے اسے ملامت کیا۔ اسے میری کمپنی سے وابستگی کا خیال بھی
آیا۔ سو وہ رقم لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے معاف کر دیا اور جو آرڈر
ہمیں ملا تھا وہ بھی مکمل ہو گیا ہے۔ عید پر تمام ورکرز کو بونس دینے کے علاوہ میں نے

اپنے کیشیئر کی بہنوں کے جہیز کا بندوست بھی کر دیا ہے اور اسے کچھ اضافی رقم بھی
دے دی ہے تاکہ وہ شادی کے اخراجات آسانی سے اٹھا سکے۔ میں نے ٹھیک کیا نا
ستارہ...... وہ ساری تفصیل بتانے کے بعد اس سے پوچھ رہا تھا۔

''جی''...... وہ اس کے اس عمل پر بے انتہا خوش ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے گھر کے ملازموں کو بھی صرف اس لیے چھٹی دے دی تھی تاکہ تمہیں کام
کرنا پڑے۔ میں چیک کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آرام کی عادی تو نہیں ہو گئیں اور اگر کبھی
خدانخواستہ مجھ پر برا وقت آ جائے اور میرے پاس کچھ نہ رہے تو کہیں تم مجھے چھوڑ تو
نہیں جاؤ گی خود کام کرنے سے گھبرا کر۔ لیکن یار آفرین ہے تم پر۔ تم نے تو سب کچھ
کر دکھایا۔ میری ڈانٹ، مار، زیادتیں سہیں اور اُف تک نہیں کی۔ بیماری میں بھی کام
میں جتی رہیں۔

سچ ستارہ...... میں تمہاری بیماری سے بہت پریشان ہو گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے''۔ وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔

ستارہ...... کیا تم میری معذرت قبول کرو گی؟''۔ بادل خان نے ندامت
بھرے لہجے میں پوچھا تو اس نے بہت بے قرار اور پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا
اور بولی۔ ''مجھے آپ کی معذرت نہیں چاہیے''۔

''تو کیا محبت چاہیے؟''۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''ہاں''۔ اس نے بے اختیار
کہا۔

تو لو میری جان۔ بادل خان نے اس کے چہرے دکھ، ملال اور کرب کے رنگ
مٹا کر اپنی محبتوں اور چاہتوں کے رنگ سجا دیئے۔

بادل...... وہ اس کی نوازشوں اور محبتوں پر آبدیدہ ہو گئی۔

''ستارہ...... کیا معاف نہیں کرو گی مجھے کہو تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا ہوں تم
سے''۔

وہ اس کے رونے سے پریشان ہو کر بولا اور ہاتھوں کو قریب لانے لگا تو ستارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔نہیں بادل...... وہ اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے لگا کر رو پڑی۔

رو نہیں ستارہ...... دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟''۔وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولا۔

''کیا؟''۔اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کا دل اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب گیا۔

''تم نے تو میرا دل ہی نکال لیا ہے۔شاپنگ کے لیے چلو گی''۔وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں''۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔''آج چاندرات ہے عید کی شاپنگ نہیں کرنی''۔

''اب سب کچھ تو ہے میرے پاس''۔اس نے بادل خان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ ہنس کر بولا۔''عیدی تو لو گی نا''۔

''آپ دیں گے''اس نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں شوخی اور شرارت رقص کر رہی تھی۔

جناب...... دیں گے بھی اور لیں گے بھی''۔وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پیار سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا تو اس بڑی ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔''تو پہلے دیں عیدی''۔

''ہم تو دینے کے لیے بے چین اور بے تاب ہیں جان بادل...... بادل خان نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس پر اتنی شدتوں سے اپنی محبتوں کے پھول برسائے کہ وہ ان کی خوشبو سے مہک اُٹھی۔حیاء سے اس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔شرم وحیا کے حسین رنگوں نے اس کے چہرے کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

''ہٹیں ناں عید تو کل ہے''۔کہاں تو وہ اس کی محبتوں کو ترس رہی تھی اور کہاں

اب اس کی محبتوں سے بوکھلا گئی تھی اور راہ فرار ڈھونڈ رہی تھی۔شرگیں لہجے میں بولی۔

گھبراؤ نہیں یہ عیدی تمہیں کل بھی ملے گی۔چاندرات کی عیدی تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی اور یہ عیدی تمہیں اب انشاء اللہ ہر چاندرات کو ملا کرے گی''۔وہ ہنس کر شوخی سے بولا۔

''صرف چاندرات کو''۔اس کی زبان بے اختیار پھسلی تھی اب اس کی صورت دیکھنے والی تھی۔بادل خان اس کی بے اختیاری پر خوشدلی سے ہنس پڑا۔

''نہیں ہر رات کو''۔بادل خان نے اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے کہا۔تو وہ سٹپٹا کر شرما کر بھاگنے لگی مگر اس کے حصار سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

بادل...... کی پناہ سے نکل کر کہاں جاؤ گی ستارہ جان...... اب لاؤ میری عید دو''۔وہ شوخ وشریر لہجے میں بولا اور آنکھوں میں والہانہ پن اور محبت چھلک رہی تھی۔

''عید تو کل ہے''۔اس نے جان چھڑانا چاہی مگر وہ چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کل کی کل دیکھی جائے گی ابھی آج کا حساب تو بیباق کر لو۔وہ گستاخیاں کر رہا تھا اور شرارت بھرے لہجے میں اسے شرمانے اور بوکھلانے پر کمر بستہ تھا۔

بادل۔اس نے بمشکل اس کی صورت دیکھی تو وہ مسکرایا۔''میری عیدی''۔

''اچھا ایک منٹ''۔وہ چند لمحے سوچ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہائیں ہائیں کدھر بھئی، میں ادھر بیٹھا ہوں''۔وہ اس کا بازو پکڑ کر شرارت سے بولا۔تو وہ شرما کر ہنس پڑی۔''ایک منٹ انتظار نہیں کر سکتے''۔

''اب نہیں کر سکتے''۔وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے جو اتنا انتظار کرایا۔میں تو شروع کے ایک مہینے کی محبتوں میں ہی زندگی

ڈھونڈتی رہی تھی اب تک تین ماہ اور سات دن آپ نے مجھے بہت اذیت آمیز انتظار سے دو چار کیا ہے آپ کو تو خبر بھی نہیں ہوئی کہ میں کن تکلیفوں سے گزرتی رہی''۔

''آئی ایم سوری ستارہ...... اب تو میں تمہارا جی جان سے خیال رکھوں گا اور ہاں میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں پانچ کی جگہ دس لاکھ روپے جمع کروا دیئے ہیں''۔

وہ نادم ہو کر بولا۔

''مجھے دولت کی طلب تو نہیں ہے''۔ اس نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پیار کی تو ہے نا''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو اس نے پوچھا۔

''کیا آپ کے پیار پر میرا حق نہیں ہے بادل؟''۔

''ہے صرف تمہارا حق ہے میرے پیار پر مجھ پر بھی اور میری ہر چیز پر بھی یہ گھر کیا اور فیکٹری کمپنی کیا سب پر تمہارا حق ہے۔ تم نے مجھے جیت لیا ہے ستارہ۔ تمہاری محبتوں اور وفاؤں نے مجھے جیت لیا ہے۔ میں تمہاری محبتوں کے سامنے ہار گیا ہوں''۔

کتنا خوبصورت اعتراف کر رہا تھا وہ ستارہ کی روح کا ہر زخم بھر گیا ہر دکھ مٹ گیا وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''محبت میں ہار محبت تو نہیں ہوتی ہے بادل...... محبت میں تو دونوں فریق برابر ہوتے ہیں''۔

''اچھا جی تو حساب برابر کریں ناں دیں ہماری عیدی''۔ وہ ایک دم سے پٹڑی سے اترتے ہوئے بولا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''اچھا دیتی ہوں''۔

وہ اٹھ کر وارڈروب کی دراز میں سے اپنی میڈیکل رپورٹس نکال لائی وہ بیڈ پر بیک سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گیا تھا اور اسے بہت محبت سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ لیجئے''۔ اس نے رپورٹ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''یہ کیا ہے؟''۔ اس نے تعجب سے اسے دیکھا تو اس نے بتایا۔ میری میڈیکل رپورٹس۔

''کیا؟''۔ وہ جھٹکے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا لفافہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا۔ جانے وہ کیا سمجھا تھا کہ پریشان ہو گیا تھا۔ اور اس کے شانوں کو تھام کر دیوانگی کے عالم میں بولا۔ ''کیا ہوا ہے تمہیں۔ دیکھو ستارہ ...... مجھ سے بے وفائی مت کرنا۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں''۔

''وقت آنے پر جانا تو پڑے گا اور اس میں کیا قصور ہے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے''۔ وہ اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے خود بھی اصل بات بتانے کی بجائے سنجیدگی سے معنی خیزی سے گویا ہوئی تو اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔

ستارہ...... فار گاڈ سیک ...... مجھے میری زیادتیوں کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ مانا کہ میں نے تم پر بہت ظلم کیا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے چھوڑ جاؤ...... تم بہت بہادر ہو ستارہ ...... تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا''۔ وہ رو دینے کو تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ستارہ کا دل تڑپ گیا اور اس نے مزید اسے ستانے کا ارادہ ترک کر دیا اور لفافہ اٹھا کر کھول کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کچھ تو ہو سکتا ہے نا''۔

یہ...... ستارہ...... یہ تم ستارہ جو میں نے پڑھا ہے اس میں وہی لکھا ہے نا''۔

وہ حیرت، مسرت اور بے یقینی سے کاغذ پڑھنے کے بعد اس سے پوچھ رہا تھا۔

''کیا پڑھا ہے آپ نے؟''۔ وہ مسکرانے لگی۔

''یہی کہ تم اُمید سے ہو''۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلے حیا کے رنگوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''نا اُمید تو میں کبھی بھی نہیں ہوئی''۔ وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''تو یہ سچ ہے''۔

''ہوں''۔ وہ بڑے دلنشین انداز میں مسکرائی۔

اوستارہ کی بچی...... وہ آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ لگا کر خوشی سے رو پڑا۔

یا اللہ مجھے گنہگار پر اتنی کرم نوازی میں کس طرح شکر ادا کروں۔ وہ پرنم آواز میں بولا۔

اے خدا...... ستارہ تمہاری وہ تھکی تھکی سی حالت، اُڑی اُڑی سی رنگت، تمہاری بیماری۔ بیہوشی وہ سب اس وجہ سے تھی اور میں سمجھ ہی نہیں سکا۔ اُف خدایا۔ میرے اس وحشی پن کی وجہ سے اگر میرے اس چاند اور میری ستارہ کو کچھ ہو جاتا تو۔

''تو لگ پتا جاتا جناب کو''۔ ستارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''الو کی دم، بتایا کیوں نہیں تھا مجھے؟''۔ بادل نے اس کی گال پر ہلکی سی چپت رسید کر دی لہجے میں پیار بھری خفگی نمایاں تھی۔

''اب تو بتا دیا ہے اب بھی مار رہے ہیں پہلے بھی دو بار تھپڑ مارا تھا''۔ وہ روہانسی ہو کر بولی تو اس نے اس کے گال کو نرمی سے چھوا اپنے پیار سے اس کا سارا درد سمیٹ لیا اور اسے اپنے اندر سمیٹتے ہوئے بولا۔ اب تو پیار سے مارا ہے''۔

''اور پہلے''۔

پہلے تم نے ٹرین میں جب یہ اعتراف کیا تھا کہ تم گھر سے بھاگ کر آئی تو مجھے غصہ آ گیا تھا کیونکہ میں تو تمہیں دوسری لڑکیوں سے مختلف سمجھتا تھا۔ اس لیے میرا ہاتھ اُٹھ گیا تھا۔ اصل بات تو بعد میں معلوم ہوئی تھی اور دوسری بار تم نے مجھے طعنہ دیا تھا کہ مجھے اپنی عزت کا رتی برابر بھی خیال نہیں ہے۔ تمہارا غصہ بجا تھا لیکن چونکہ میں دل سے تمہاری عزت کرتا تھا مجھے تمہاری عزت کا خیال تھا اس لیے مجھے تمہاری بات پر غصہ آ گیا اور میرا ہاتھ تمہارے اس پھول سے گال پر پڑ گیا۔ اتنی بڑی خوشی دی ہے تم نے مجھے اب ساری پرانی باتیں بھلا دو ستارہ۔ اب ہم محبتوں سے اپنی زندگی کا نیا دور شروع کر رہے ہیں۔ وہ وضاحت کرنے کے بعد اس کے بولنے کا منتظر ہی رہا مگر

وہ بس خاموش رہی۔ اس کی محبتوں پر دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

''ستارہ تم بھی تو کہو؟''۔ بادل خان نے پیار سے کہا۔

''آپ بہت اچھے ہیں''۔ اس نے محبت سے اس کی صورت دیکھتے ہوئے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے دل سے کہا تو وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

تھینک یو ستارہ...... میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا شروع دن میں تم اپنے اس بیان پر قائم ہو تھینک یو جان...... اب اگر ساری دنیا مل کر مجھے برا کہے گی نا تو میں برا نہیں مانوں گا۔ وہ اس کے ہاتھ چوم کر اسے اپنے ساتھ لاتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کوئی آپ کو برا نہیں کہے گا آپ تو بہت اچھے ہیں''۔ اس نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

''تمہارے لیے ہوں نا، ان کے لیے تو نہیں جنہیں تمہاری وجہ سے چھوڑ چکا ہوں''۔

''چھوڑیں بھی ان کی باتیں...... اللہ انہیں نیک ہدایت دے۔ آپ ان کی پرواہ مت کریں''۔

ستارہ...... جان...... پرواہ تو ہم اب صرف آپ کی کریں گے آپ کی عید کی شاپنگ ہم کر چکے ہیں پہلی عید بہت شاندار طریقے سے منائیں گے ہم آپ پھر دلہن بنیں گی۔ اور ہاں ایک بات اور

''وہ کیا؟''۔ ستارہ نے خوشی سے حیا سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ اس کی میڈیکل رپورٹ کا لفافہ اسے دکھاتے ہوئے شوخ و شریر لہجے میں پوچھنے لگا۔

''کیا تم بھی مجھے ہر چاند پر ایسی ہی عیدی دیا کرو گی؟''۔

اُف بادل...... وہ اس کا اشارہ سمجھی تو بری طرح شرما گئی بے ساختہ ہنسی اور پھر اس کے محبت بھرے دامن میں چہرہ چھپا لیا۔ بادل بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

بادل اور ستارہ کے پاس اس چاند کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہونے والی ہے۔

ستارہ...... جو احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری ہمیں ہمارے والدین نے دیا تھا وہ ہم اپنی اولاد کو نہیں دیں گے۔ ہمارے بچے ہماری محبت اور توجہ میں پروان چڑھیں گے۔ سن رہی ہونا۔ وہ پیار سے سنجیدگی سے بولا۔

''ہوں ...... آپ کے دل کی دھڑکن''۔ ستارہ نے اس کے سینے سے لگے لگے جواب دیا تو بادل خان ہنس کر بولا۔ ''وہ تو تم ہو''۔

اور ستارہ اس کی ہر بات پر دل و جان سے ایمان لے آئی۔ وہ اپنی ہر زیادتی کا ازالہ اپنے رویئے سے، سلوک اور برتاؤ سے کر رہا تھا۔ بادل خان اس پر پیار کا بادل بن کر دھیرے دھیرے برس رہا تھا۔ اور وہ اس کے پیار کی بارش میں بھیگتی چلی جارہی تھی۔ باہر کا عید چاند مسکرا رہا تھا اور اندر بادل اور ستارہ کا پیار۔

عید ہو...... دید ہو یا کوئی جان سے پیارا۔

سب کا ایک ہی اشارہ۔

بادل، چاند اور ستارہ......

☆☆☆